ایک لڑکی ایک جام

امرتا پریتم

PDFBOOKSFREE.PK

فہرست

ایک لڑکی ایک جام ۷
لال مرچ ۱۸
تجارت کا سوال ۲۸
ہڈیاں اور پھول ۴۶
چاندنی رات ۶۰
نیل کمل ۷۳
دھواں اور شعلہ ۸۴
ملاقات ۹۴
پانچ بہنیں ۱۰۴
گھائل خواب ۱۱۷

ایک لڑکی ایک جام

مشہور مصور سمیش نندا کی یہ کہانی دراصل میں نے پچھلے برس لکھی تھی۔ دِلّی میں اُن کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ ہفتہ بھر لگاتار کسی نہ کسی اخبار میں اُن کے فن پر تبصرہ شائع ہوتا تھا۔ بڑے بڑے دانشور یہ تعریفی تنقید لکھتے تھے۔ مجھے فنِ مصوری سے متعلق صرف اتنی ہی واقفیت تھی جتنی کہ فن سے بے بہرہ مگر حسّاس شخص کو ہوتی ہے۔

نمائش میں رکھی گئی تصویروں کی خاموشی سے تعریف کرتے ہوئے میری آنکھیں سمیش نندا کی دو تصویروں پر جم کر رہ گئیں۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا ——— "ڈھائی پتیاں، ڈیڑھ پتی ــ" اور دُوسری تصویر کے نیچے لکھا تھا ——— "ایک لڑکی، ایک جام"۔

FREE PDF BOOKS
www.pdfbooksfree.
TRUSTED DOWNLOADS
Download Free Pdf Books, High Quality Islamic books, Urdu, English, Pashto, Books and Novels on Islamic History, Action, Adventure, Romance, Horror, Poetry books in Urdu Pashto, and Persian languages

پہلی تصویر چائے کے باغ میں چائے کی پتیاں چُنتی ہوئی دو پہاڑی دوشیزاؤں کی تھی اور اس تصویر کا مفہوم مصوّر نے کچھ یوں سمجھایا تھا۔” چائے کے پودے کی آخری کونپل صرف ڈیڑھ پتی ہوتی ہے۔ ایک پُوری پتی اور اس سے جُڑی ہوئی ایک ننھی سی پتی۔ اس ڈیڑھ پتی کی آب و تاب ذرا مختلف ہی ہوتی ہے۔ اِس آخری کونپل کے نیچے ڈھائی پتیاں اُگتی ہیں۔ نہایت نرم اور پھر اُس سے نیچے موٹی پتیوں کی کئی ڈالیاں ہوتی ہیں۔ ڈھائی پتیاں اور ڈیڑھ پتی توڑ کر الگ رکھ لیتے ہیں۔ اِن پتیوں سے جو چائے بنتی ہے وہ بہت مہنگی ہوتی ہے۔ ہم لوگ جو چائے پیتے ہیں وہ موٹی پتیوں کی ہوتی ہے۔ ایک ثابت و سالم پودے سے چائے کی صرف چار ننھی پتیاں اُترتی ہیں۔ سارے باغ سے آخر کتنی پتیاں حاصل کی جا سکتی ہیں؟ وہ چائے ساٹھ روپے پونڈ سے بھی مہنگی ملتی ہے۔

سمیش نندا کی تصویر میں اِدھر جو پہاڑی دوشیزہ تھی اس کا چہرہ نصف سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ دیکھنے والے کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کے حُسن کا جو انداز نظر آتا تھا، اُس سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تمام پہاڑی دوشیزائیں چائے کا ایک پودا ہوں . . . بکھرا اور پھیلا ہوا پودا۔ اور اِس طرف کھڑی ہوئی وہ لڑکی جیسے اُس پودے کی آخری کونپل تھی . . . . مگر میں نے اپنی یہ رائے اپنے دِل ہی میں محفوظ رکھی اور مصوّر سے کچھ نہ کہا۔

دُوسری تصویر جس کے نیچے ”ایک لڑکی، ایک جام“ لکھا تھا، پہاڑی دوشیزہ کے انوکھے حُسن کی حامل تھی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں ”مُنہ بولتی تصویر“ سچ مچ میں نے ایسی مُنہ بولتی تصویر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اِس کے بارے میں مصوّر نے کوئی وضاحت پیش نہیں کی تھی۔ میں نے یہی کہا ”ایسا جام پینے کے لئے ایک عُمر بھی کم ہے۔“

مصوّر نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا۔ مصوّر کی عُمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ نہ جانے شباب کا کون سا عالم اُبھر کر اُس کی آنکھوں میں آگیا تھا ——— وہ بولا —” اِس تصویر کی آج تک ایسی ترجمانی کسی اور نے نہیں کی۔ یہ تو دراصل وہی بات ہے جسے میں کہنا چاہتا تھا . . . . اور تو اور میرے احباب نے بھی اِس تصویر کے یہ معنی نہیں نکالے۔ کچھ لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں —” ایک لڑکی، ایک جام —“ جام تو ہر روز نیا میسّر آ سکتا ہے۔“

نہ جانے اِس تصویر میں کون سی کشش تھی کہ نمائش ہفتہ بھر رہی اور میں وہ نمائش تین بار دیکھنے گئی ——— دراصل وہ نمائش ہی ”ایک لڑکی، ایک جام“ تھی۔

وہ کوئی فنّی اور شعوری بات نہیں تھی۔ میں نے اپنے دِل سے اُٹھی ہوئی ایک سادہ سی بات سمیش نندا کی تخلیق سے متعلق کہہ دی تھی۔ یہ سادہ سی بات مصوّر کا دِل ٹٹول کر اُس کے ہونٹوں پہ آ گئی۔

"میں کانگڑہ کے فنِ مصوری کی تحقیق کے لئے ایک گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پالم پور کے چائے کے باغات کچھ زیادہ دُور نہیں تھے۔ یہ تصویر "ڈھائی پتیاں ڈیڑھ پتی" میں نے وہیں بنائی تھی۔ یہ لڑکی جو اِس طرف کھڑی ہے، دراصل وہی لڑکی ہے جسے میں نے دُوسری تصویر "ایک لڑکی ایک جام" میں دِکھایا ہے۔"

"یہ بات تو میں نے آپ کے بتانے سے پہلے نہیں پہچانی تھی۔ لیکن پہلے ہی دِن یہ تصویر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہُوا تھا جیسے تمام لڑکیاں چائے کا پودا ہوں۔ اور یہ لڑکی اُس پودے کی بالائی کونپل ہو۔ سبز، ننھی، اور چمکتی ہُوئی۔"

سمیشس نندا کی بُوڑھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اُنھوں نے کہا ——"اب تو مجھے اور بھی یقین ہوگیا ہے۔ تم نے تو مجھ سے میرے دِل کی بات کہلوالی ہے تم نے جس انداز میں میری دونوں تصویروں کا مطلب بیان کیا ہے اُس سے میری کہانی سُننے کا تمہیں حق حاصل ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے میری کہانی کوئی نہیں سُن سکا۔"

"میں نے اُس لڑکی کو "لُوٹنی" کے نام سے پکارا تھا۔ میں نے اس کا اصل نام پُوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اُس نے چائے کی پتیاں چُنتے ہوئے "ڈھائی پتیاں

اور ڈیڑھ پتی" والی بات مجھے سُنائی تھی اور میں نے اس سے کہا تھا کہ تو بھی تو ان دوشیزاؤں کے پودے کی بالائی کونپل ہے —— بہت مہنگی —— خیر نہیں یہ چائے کون پیئے گا؟"

"برسات کے دِن تھے۔ ایک نالے میں باڑھ آگئی اور آس پاس کے دیہات کو آپس میں مِلانے والی سڑک زیرِ آب ہوگئی۔ تین روز کے بعد اُس سڑک کا بدن دِکھائی دیا۔ اِدھر سے میں جا رہا تھا، اور اُدھر سے لُوٹنی آرہی تھی۔ میں نے کہا ——"آخر بارش تھم ہی گئی ایک بار تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ طغیانی رُکے گی نہیں۔

کُچھ خبر ہے کہ لُوٹنی نے کیا کہا ——"بابو! یہ بھی کوئی اِنسان کے آنسو ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتے۔"

میں لُوٹنی کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اُس کی صورت بے حد حسین تھی۔ وہ ایسی بات بھی کہہ سکتی ہے، میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسی بات میں نے ایک بنگالی ناول میں پڑھی تھی۔ مگر لُوٹنی نے تو کبھی بنگالی ناول نہیں پڑھا تھا۔ شاید سارے دیشوں کے دُکھ کی ایک ہی زبان ہوتی ہے۔

میں اس کے گھر بھی گیا۔ اس کا باپ تھا، ماں تھی، بہن تھی۔ دو بھائی تھے۔ ایک بھابی تھی۔ میں نے اُس کے سارے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ بات نہ جانے اس

کے دِل کے کِس گوشے سے اُبھری تھی۔ میں نے اس کے دُکھ کے بیج ڈھونڈ لئے۔ اس کے باپ کے سر پر قرضہ کا بھاری بوجھ تھا۔ وہاں لڑکیوں کی قیمت پڑتی تھی تین چار سو روپے سے ایک ہزار روپے تک۔ اور ایک قرض خواہ نے پندرہ سو روپے کے بدلے میں اُسے مانگ لیا تھا۔ ٹونی کہتی تھی ـــــ" وہ اِنسان نہیں دیو ہے۔ مجھے خواب میں بھی اس سے خوف آتا ہے۔"

ایک دِن میں نے ٹونی سے تنہائی میں پُوچھا" اگر میں تیرے خوف کے بندھن کاٹ دُوں تو؟"

"وہ کیسے بابو؟"

"میں پندرہ سو روپے دِے دیتا ہُوں۔ تم اپنے باپ سے کہہ کر وہ منگنی توڑ دو۔"

اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو میرے پاؤں پکڑ لیتی۔ مگر ٹونی نے سیدھا میرے دِل پر ہاتھ ڈال دِیا اور کہنے لگی ـــــ "بابو! کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

کبھی میں نے کہا تھا ـــــ" ٹونی تو چائے کے پودے کی بالائی کونپل یعنی سب سے بیش بہا کونپل ہے ـــــ بہت ہی مہنگی ـــــ خبر نہیں یہ چائے کون پیئے گا؟" اور آج ٹونی نے اپنی ہٹ دھرمی سے اس پتّی کی چائے تیار کر دی تھی۔ میں نے یہ بات نہ سوچی تھی نہ کہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھانا چاہا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ لیکن اُس کے تن

بدن میں آگ لگ گئی اور اُس نے کہا ـــــ" بابو! کیا میں بھکارن ہُوں؟"

میری اپنی زِندگی بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ کتنی ہی لڑکیاں میری زِندگی میں آئی تھیں اور چلی گئی تھیں۔ میں صِرف تھوڑی دُور تک ہی اُن کے ساتھ چل سکا تھا۔ اُن کے ساتھ طویل مسافت طے نہیں کی تھی۔ اور اب میرا اعتماد ہی اُٹھ چکا تھا۔ کہ میں زندگی بھر کِسی کا ہم سفر ہو سکوں گا۔

"میری زِندگی بہت گرم ہے۔ ٹونی تو اِسے نہیں پی سکے گی۔ تیرے ہونٹ جھُلس جائینگے۔" اور میں نے اس کا دِل رکھنے کے لئے اُس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھدی۔

"میں پھُونک پھُونک کر اُسے پی جاؤں گی بابو۔"

"میں نے اُس کی یہ بات سُنی۔ اُس گھڑی اُس کے چہرے کا جو انداز تھا اُس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہی وہ ٹونی ہے جس کے ساتھ میں زِندگی کی طویل مسافت طے کر سکتا ہُوں۔"

اپنے فیصلہ کو میں نے چاندی کے سکّے کی طرح ٹھنکا کر دیکھا۔ میں نے کہا۔" تمہیں شاید معلوم نہیں میری زندگی میں کتنی ہی لڑکیاں آچکی ہیں۔ ہر ایک لڑکی کو میں نے شراب کے جام کی طرح پیا اور اپنا جام شراب سے

دوبارہ لبریز کرلیا۔“

وہ ہنس پڑی اور بولی ـــــ ”کیوں بابو! کیا تمہاری پیاس نہیں بجھتی؟“

میں نے اُس سے کچھ نہ کہا اور وہ بولی ـــــ ”بہت اچھا بابو ـــــ ایک بار جام بھر لو اور جب تک میرے دِل کا یہ جام ختم نہ ہو جائے تب تک کسی اور جام سے اپنے ہونٹ نہ لگانا۔“

مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اب تک جتنے جام پیئے تھے وہ اجسام کے جام تھے دِل کے جام نہیں تھے۔ اگر کوئی ایسا جام ہوتا تو پھر جب تک اُس کی شراب ختم نہ ہو جاتی تب تک میں کِسی دوسرے جام سے مُنہ نہ لگا سکتا۔ شاید دِل کے جام کی شراب کبھی ختم نہ ہوتی۔

میں نے اپنے فیصلہ کا روپیہ ٹنکا کر دیکھ لیا تھا ـــــ ٹونی کا فیصلہ تو درست تھا ہی، ٹونی کے ماں باپ نے ہم دونوں کا فیصلہ تسلیم کرلیا۔ اور میں روپوں کا اِنتظام کرنے کے لئے شہر واپس آگیا۔“

سمیتش نندا نے جب اپنی کہانی کا آغاز کیا تھا تو اُس وقت آٹھ بجنے والے تھے آٹھ بجے نمائش کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔ اِس لئے تصویریں دیکھنے والے لوگ لوٹ گئے تھے۔ کِسی نئے شخص کو وہاں آنا نہیں تھا۔ کہانی اپنے انجام کو نہیں پہنچی تھی مگر کہانی

کو یہاں تک لاکر مصوّر نے اُسے وہیں روک دِیا تھا ـــــ میں مصوّر کی طرف دیکھتی رہی ـــــ رُکی ہوئی اس کہانی کے بارے میں سوچتی رہی۔ مصوّر جیسے بیخودی کے عالم میں کھو گیا تھا۔

چپڑاسی نمائش گاہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے دہلیز میں آکھڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کی تنبیہہ کی اور انتظار کرتی رہی کہ شاید رُکی ہوئی کہانی آگے چل پڑے۔

مصوّر کی بند آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے اشکوں کی روانی نے کہانی کو بھی آگے بڑھا دیا ـــــ ”میں جب روپے لے کر واپس گیا تو قِسمت میرا جام میرے ہاتھوں سے چھین چکی تھی۔“

”کیا باپ نے ٹونی کا در پردہ، بیاہ کر دیا تھا؟“ میں نے کانپتے ہوئے پُوچھا۔

”نہیں! اِس سے زیادہ بھیانک حادثہ ہوا ـــــ ٹونی جس شخص کو دیو کہا کرتی تھی اُس ساہوکار نے اپنا سودا لُوٹنے کی خبر سُن لی تھی اور اُس نے دھوکے سے کِسی کے ہاتھوں ٹونی کو زہر پلوا دیا تھا۔

”ٹونی کی چِتا میں ابھی کچھ آنچ باقی تھی ـــــ تھوڑی سی آگ۔ میں نے اُس آگ کو گواہ بنایا اور چِتا کے گِرد گھوم کر جیسے پھیرے لے لئے . . .“

مصور نے شاید تیس پینتیس برس کی عُمر میں وہ پھیرے لئے ہوں گے۔ اگلے تیس برس تک نہ جانے کیسے اس نے ان پھیروں کی لاج رکھی ہوگی۔ یہ بات اس کے ساٹھویں برس سے بھی صاف ظاہر ہو رہی تھی پُوچھنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے یہ بیسویں صدی اسے سلام کر رہی ہو۔ آہستہ آہستہ مصوّر کے ہونٹ پھڑکے۔

"ٹونی نے کہا تھا۔ ایک اقرار کرو بابُو۔ جتنی دیر تک میرے دِل کا جام ختم نہ ہو اُتنی دیر تک کسی اور جام سے اپنے ہونٹ نہ لگانا۔ . . . . اور وہ سامنے کھڑی ہوئی لڑکی گواہ ہے کہ میں نے کسی اور جام سے ہونٹ نہیں لگائے۔"

سامنے ٹونی کی تصویر تھی ——— ٹونی ——— "ایک لڑکی، ایک جام"۔ موت نے مصوّر کے ہاتھوں سے وہ جام چھین لیا لیکن کوئی موت اُس کے تصوّر سے وہ جام نہ چھین سکی۔ اور مصوّر کی ساری عمر اُسے پیتے گزر گئی۔ اس صُراحی کی شراب ختم نہ ہُوئی۔

لگ بھگ ایک برس ہو چُکا ہے۔ میں نے سمیش نندا کی زبان سے یہ کہانی سُنی تھی۔ اور پھر اگلے ہفتہ اُسے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ لیکن اُنہوں نے مجھے اسے چھاپنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس وقت میں نے کہانی میں اُن کا نام بدل کر لکھا تھا۔ مگر انہوں نے کہا تھا کہ جب تک میری عمر کا آخری دِن نہیں آتا تب تک میرا اِس پر کوئی حق نہیں۔ اِس جام کو پیتے ہوئے مجھے آخری سانس لینے دو۔ پھر اس کہانی کو شائع کرنا۔ ابھی نہیں۔ اس وقت میرا نام بھی بدل کر نہ لکھنا۔

پچھلے ہفتہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا ——— "مشہور مصوّر سمیش نندا وفات پا گئے"۔ مصور کے فن سے متعلق اخباروں نے یہ بھی لکھا تھا ——— "جس کمرے میں مصوّر نے آخری سانس لیا، اس کمرے میں صرف ایک ہی تصویر ٹنگی ہوئی تھی ——— "ایک لڑکی، ایک جام"۔" عُمر چھوٹی تھی ——— جام بڑا تھا ——— آج مصور کا وہ دعویٰ درست ثابت ہوا۔ میں نے اِس کہانی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ صرف اُن کا اصل نام لکھا ہے اُن کے کہنے کے مطابق۔

لال مرچ

"ڈاکٹروں کے انجکشن کو چھوڑو یار، جس گھر کے کُتّے نے کاٹا ہے اُس گھر کی لال مرچیں اپنے زخم پر لگا لو۔" ایک دوست نے کہا۔

"جس گھر کے کُتّے نے کاٹا ہے، اگر اُس گھر کی کوئی خوبصورت لڑکی تمہارے زخم پر پٹی باندھ دے.... لڑکیاں بھی تو لال مرچ ہوتی ہیں۔" دوسرے دوست نے کہا۔

کالج کے تمام دوست لڑکے ہنس پڑے۔

اور وہ جِسے کُتّے نے کاٹا تھا ہنسکر کہنے لگا۔ "یار نسخہ تو اچھا ہے، مگر یہ تمہارا آزمودہ ہے نا؟"

گوپال نے عمر کی اٹھارہویں سیڑھی پر پاؤں رکھا ہوا تھا، اور گوپال کو محسوس ہوا کہ اس سیڑھی پر جوانی کے احساس کا

ایک کُتّا دُبک کر بیٹھا ہوا تھا، اور آج اُس نے اچانک پاگلوں کی طرح اُٹھ کر اُس کی ٹانگ میں سے گوشت نوچ لیا تھا۔

اس روز سے گوپال کا دِل اپنے زخم پر لگانے کے لئے ایک لال مرچ جیسی لڑکی تلاش کرنے میں لگ گیا تھا۔

لڑکیاں تو گوپال کے کالج میں بھی تھیں، پڑوس کے گھروں میں بھی، اُس شہر کی گلیوں میں بھی، اور دُوسرے تمام شہروں میں بھی۔ "مگر جس لڑکی کو میں تلاش کر رہا ہُوں وہ کون ہے؟" گوپال اکثر یہ سوچتا۔

اور پھر گوپال لڑکیوں کو ایسے دیکھتا جیسے تھالی میں دال کو چُنا جاتا ہے۔ چھوٹے قد کی۔ موٹی۔ چپٹی ناک والی۔ لمبی۔ لَول مٹول۔ اور جَب ایسی لڑکیوں کو وہ دال میں کنکروں کی طرح چُن لیتا تو اُسے تمام پُرانی تشبیہیں یاد آ جاتیں۔ لچکتی ہوئی ٹہنی جیسی لڑکی۔ چندن جیسی لڑکی۔ دیودار کے پیڑ جیسی لڑکی۔ چاند کی پھانک جیسی لڑکی..... اور پھر گوپال سوچتا "کوئی بھی نہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی نہیں۔ مجھے تو صرف لال مرچ جیسی لڑکی چاہیئے۔"

ویسے تو کالج کے تمام لڑکوں میں کتابوں اور کورس کے بجائے لڑکیوں کی باتیں لمبی ہو گئی تھیں۔ مگر گوپال کی ہر بات کو جیسے "لڑکی" لفظ کے دروازے میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ کبھی ریڈیو پر نور جہاں کی آواز آتی "تیرے مکھڑے تے کالا کالا تِل وے ــــ او منڈیا سیال کوٹیا" تو گوپال اپنے لال

ہونٹوں پر ایک موٹے کالے تل کو اُنگلی سے ٹٹولنے لگتا اور پھر جیسے نُور جہاں سے مخاطب ہو کر کہتا "ظالم ہر بار کہتی ہے سیال کوٹ کے لڑکے، کبھی اسکی جگہ لائل پور کے لڑکے تو کہا کر"۔ نُورجہاں نے تو گوپال کی بات کبھی نہیں سُنی۔ مگر کالج کے لڑکوں نے ضرور گانا شروع کر دیا "او منڈیا لائل پوریا"۔

بھنے ہوئے چنے بیچنے والا کہتا "بمبئی کا بابو میرا چنا لے گیا" تو گوپال ہنستا "چنا لے گیا تو ایسے کہتا ہے جیسے اُس کی لڑکی بھگا کر لے گیا ہے"۔

عینکوں والی لڑکیاں گوپال کو لڑکیاں نہیں لگتی تھیں۔ "جب بھی آنکھ کو دیکھنا ہو پہلے شیشے کی دیوار پار کرنی پڑتی ہے"۔ گوپال کہتا اور ان لڑکیوں کو لڑکیوں کی فہرست میں سے ہی نکال دیتا۔

کسی لڑکی نے اونچی ساڑھی باندھی ہوئی ہوتی، پاؤں میں موزے پہنے ہوئے ہوتے، ہاتھ میں چھتری پکڑی ہوتی تو گوپال ہنس کر منہ پھیر لیتا "یہ لڑکی تھوڑی ہے۔ یہ تو ماسٹرنی ہے ماسٹرنی۔ جو طالب علم حساب میں کمزور ہو وہ ماسٹرنی سے شادی کر لے"۔

کوئی لڑکی گہرے رنگوں کے کپڑے پہنے ہوتی یا باہنوں میں چوڑیاں ہی بہت زیادہ ہوتیں تو گوپال کہتا "یہ تو رنگوں کا اشتہار ہے۔ لڑکی تو دکھائی دیتی ہی نہیں، بس پوری کی پوری چوڑیوں کی دوکان ہے"۔

کسی کی بارات جا رہی ہوتی تو اُسے دیکھ کر گوپال اُداس ہو جاتا چچ . . . . چچ . . . . چچ . بچارے کا دیوالہ نکل گیا"۔ گوپال

کہتا "جب آدمی عاشق بننے سے پہلے شوہر بن جاتا ہے تو سمجھو اب بچارے کے پاس صبر کی پونجی بالکل ختم ہو گئی۔ اور اُس نے گھبرا کر دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دی ہے"۔

"شاید وہ اپنی محبوبہ سے ہی شادی کرنے جا رہا ہو" گوپال کا کوئی دوست کہتا۔

"نہیں یار زُلف کو سر کرنے میں عمر لگتی ہے۔ غالب کی ڈوم لڑکی اور لورکا کی خانہ بدوش لڑکی۔ اِن کے دروازے پر کبھی بارات نہیں آتی"۔

اور گوپال سالہا سال اس زُلف کی باتیں کرتا رہا جس کے سر کرنے میں اُسے عمر گزارنی تھی۔

اور گوپال تشبیہوں میں کھو گیا۔ کالی رات جیسے بادل، مگر اُسے کسی رات نے نیند نہیں دی۔ گھنے جنگل جیسے بال، مگر وہ کسی جنگل میں کھو نہ سکا۔ سمندر کی لہروں جیسے بال، مگر وہ کسی لہر میں غوطہ نہیں لگا سکا۔ اور گوپال کو عُمر کے جو سال ایک زُلف کو سر کرنے میں لگانے تھے۔ وہ زُلف کو تلاش کرنے میں ہی کھوتے رہے . . . . ۔ اور پھر گوپال اپنے سالوں کے کھو جانے سے گھبرا گیا۔

"تم بھی اب ہماری طرح دیوالیہ پن کی درخواست دے دو یار"۔ کالج کے پُرانے دوستوں میں سے جب کوئی ملتا تو گوپال سے مذاق کرتا۔

عُمر کے اٹھارویں سال میں جوانی کے پاگل کتے نے گوپال

کی ٹانگ کو کاٹا تھا اور زخم پر لگانے کے لئے گوپال ایک لال مرچ جیسی لڑکی تلاش کر رہا تھا، مگر اب عمر کے تیئیسویں سال میں اِس زخم کا زہر اس کے تمام جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

اب گوپال سوچنے لگا تھا۔ وہ نہ غالب ہے نہ لورکا۔ وہ صرف گوپال ہے یا ایک ایشور داس یا ایک شیر سنگھ یا ایک اللہ رکھا۔ اور اُس نے سرنگوں ہو کر دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دی۔

"کیوں یار۔ آج ڈوم لڑکی کے گھر بارات جائے گی یا خانہ بدوش کے گھر میں؟"

"سُناؤ بھابی کیسی ہے؟"

"اور کچھ نہیں تو ہم تمہاری لال مرچ کے دیور تو بن ہی جائینگے۔"

"بیشک سونے کی انگوٹھی کی بجائے ہیرے کی انگوٹھی ہی دینی پڑے بھابی کا گھونگھٹ ضرور اُٹھائیں گے۔"

گوپال اپنے دوستوں کے مذاق کو اپنے ہاتھ پر شادی کے لال ڈورے کی طرح باندھے جا رہا تھا اور ہنستا ہوا کہتا جاتا تھا "ماسٹرنی ہے ماسٹرنی۔ عینک بھی لگاتی ہے تمہاری بھابی۔"

ماں نے جب رشتہ طے کیا تھا تو گوپال سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو کسی بہانے وہ لڑکی کو دکھا دے گی۔ مگر گوپال نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔

"جب دیوالیہ ہی ہونے کی عرضی دینی ہے تو . . . ."

ڈولی دروازہ پر آ گئی۔

"خوبصورت ہے بہو۔ گھر کا سِنگار ہے۔" اسے موہنہ دِکھائی

کے روپے دیتے وقت گوپال کی طائی کہہ رہی تھی۔

اور گوپال سوچ رہا تھا۔ جب لوگ دروازے کے سامنے کوئی بھینس لا کر باندھتے ہیں تب بھی یہی بات کہتے ہیں "بھینس تو گھر کا سِنگار ہوتی ہے۔" اور جب لوگ ڈولی لیکر آتے ہیں تب بھی یہی بات کہتے ہیں "بہو تو گھر کا سِنگار ہوتی ہے" اور پھر بھینس اور بہو میں جو فرق ہوا وہ کہاں گیا؟ اور پھر گوپال خود ہی ہنس دیتا۔ "یہ بھی وہی فرق ہے جو ایک عاشق اور ایک دولہا میں ہوتا ہے۔"

گوپال کی بیوی نہ اِتنی خوبصورت تھی اور نہ ہی اتنی بدصورت عام طور سے جیسی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ دیکھنے میں بس ٹھیک ہی لگتی تھی۔ اور گوپال کو نہ کوئی چاؤ تھا نہ کوئی شکایت۔ وہ قسم قسم کی پوشاک پہنتی مگر گوپال اُسے کبھی "رنگوں کا اشتہار" نہ کہتا تھا اور وہ سہاگ کی چوڑیاں اور جہیز کے کپڑے سب کچھ ایک ساتھ پہن لیتی۔ گوپال اُسے کبھی "زیورات کی دوکان" کا طعنہ نہ دیتا۔

آجکل گوپال کو جوانی کے شروع دِنوں میں پڑھا ہوا ایک انگریزی ناول یاد آیا کرتا تھا۔ جس میں اپنے خوابوں کی لڑکی تلاش کرنے کے لئے شاعر عمر لگا دیتا ہے۔ مگر اُسے تلاش نہیں کر سکتا۔ اور پھر مرتے وقت اپنے بیٹے کو اپنے تمام تصوّر اور اپنی تمام لگن دیکر وصیت کر جاتا ہے کہ وہ اِس قسم کی آنکھوں والی، اس قسم کے ناک نقشے والی، اور اس قسم کے بالوں والی لڑکی کو ضرور

تلاش کرے، اور تمام عمر تلاش کرنے کے بعد اُس کا بیٹا مرتے وقت یہی بات اپنے بیٹے کو وصیت کر جاتا ہے۔

"زُلف کو سر کرنے میں غالب نے تو صرف ایک ہی عمر کا اندازہ لگایا تھا" مگر گوپال سوچتا 'زندگی کی شکست غالب کے اندازہ سے بہت بڑی ہے۔

اور آج کل گوپال سوچ رہا تھا، اُس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ ہو بہو اُس کی شکل۔ ہو بہو اُس کا دِل۔ ہو بہو اس کے سپنے۔ اور پھر اُس کا لڑکا جوان ہوگا وہ ایک لال مرچ جیسی لڑکی ضرور تلاش کرے گا۔ اور پھر وہ تمام دُنیا کو اپنے بیٹے کی آنکھوں سے دیکھے گا۔

"آج میں برف والا پانی نہیں پیوں گی"۔ ایک روز گوپال کی بہو نے سکنجبین کا گلاس اپنی ساس کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ اور ماں جب اُس کے لئے چائے بنانے رسوئی گھر میں گئی تو گوپال نے اپنی بہو سے ہلکا سا مذاق کیا "میں تمام مہینے سپنے جمع کرتا ہوں۔ اور تم مہینے کے آخر میں سارے سپنے توڑ دیتی ہو۔"

شائد انہیں الفاظ کا اثر تھا کہ اگلے مہینے گوپال کی بہو کو دن لگ گئے اور گوپال کی باہوں میں جیسے ابھی سے اُس کا بیٹا کھیلنے لگا۔

"کھٹی یا نمکین چیز تو کبھی مانگتی ہی نہیں۔ ہمیشہ اُس کا دِل میٹھی چیزوں کے لئے مچلتا ہے۔ ضرور بیٹا ہوگا۔ تمہارے پیدا ہونے کے وقت مجھے بھی گڑ کی کھیر اچھی لگتی تھی" ماں

جب کبھی گوپال کو لگتا اب تو اس کا بیٹا توتلی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

یہ نو مہینے گوپال کو پچھلے نو سال کی طرح معلوم ہوئے۔ اور پھر گھر میں گھی گڑ اور اجوائن اکٹھی ہونے لگی۔

کمرے کا دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ گوپال نے باہر برآمدے میں بیٹھ کر کاغذ قلم اور ایک کتاب اپنے سامنے اِس طرح رکھی ہوئی تھی جس سے دیکھنے والے کو لگے گویا اُسے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ مگر گوپال کتاب کا کبھی کوئی ورق اُلٹتا کبھی کوئی۔ اور پھر جو صفحہ سامنے آجاتا اُس کو ہی کاغذ پہ نقل کرنے لگتا۔

دروازے کے پاس وہ جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُس کے کان اندر کی آواز سُننے کے لئے کھڑے تھے اور گوپال انتظار کر رہا تھا۔ ابھی ابھی دائی کہے گی "لاکھ لاکھ مُبارکبادیاں، گوپال کی ماں . . . . . یہ لو بیٹا ——"

ایک مرتبہ دائی باہر آئی بھی تھی۔ کہنے لگی "بیٹا گوپال۔ ذرا جا کر تھوڑا سا شہد تو لا دے۔ دیکھ کر لانا شہد نیا ہو۔"

گوپال وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیا پتہ اُس کے پیچھے . . . . جلدی ہی کچھ ہو جائے . . . . میں اُس کی پہلی آواز سُنوں گا۔ یہ سوچ کر اُس نے دائی کو ڈانٹا۔ "شہد کی یاد اب تمہیں آئی ہے۔ یہ تمام کام پڑا ہوا ہے میرے سامنے۔ کل مجھے یہ کام دفتر میں دینا ہے۔"

"تم مردوں کو تو اپنے کام کی پڑی رہتی ہے۔ آخر بوڑھی عمر ہے۔ کئی باتیں بھول جاتی ہوں۔"

دائی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ گوپال کی ماں نے مشکل حل کر دی۔ کہنے لگی ــــ "ہمارے یہاں کبھی کسی نے شہد وہد نہیں دیا۔ ہم تو اُنگلی پر تھوڑا سا گُڑ لگا کر مونہہ میں ڈال دیتے ہیں۔"

"اچھا گُڑ ہی سہی۔" اور دائی اندر چلی گئی تھی۔

گوپال کے کان پھر دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے اور اچانک بچّے کی رونے کی آواز آئی۔ گوپال کا سانس جیسے کسی نے ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔ وہ نہ نیچے آ رہا تھا اور نہ اُوپر جا رہا تھا ـــ اور ابھی تک دائی کی آواز نہیں آئی تھی۔ اُسے بچّے کی آعاز کی نسبت دائی کی آواز کا زیادہ انتظار تھا۔

اور پھر دائی کی آواز آئی "لڑکی"

گوپال کی کُرسی کانپ گئی۔ اُس کی ماں شاید پانی یا تولیہ لینے باہر آئی ہوئی تھی۔ گوپال کے ہونٹ کانپے "ماں لڑکی"

"نہیں بیٹا نہیں، تو بھی پاگل ہے۔ دائیاں یہی کہتی ہیں۔ اگر یہ کہدیں کہ بیٹا ہوا ہے تو زیادہ خوشی کی وجہ سے بہو کی جان کا خطرہ ہے۔" اور جلدی جلدی اندر چلی گئی۔ گوپال کی کُرسی اب پہلے کی نسبت اتنی نہیں کانپ رہی تھی۔ مگر پھر بھی گوپال نے اُسے دیوار کے سہارے لگا دیا تھا۔ "بیٹی ہو یا بیٹا جو بھی ہو قسمت والا ہو۔" دائی کی آواز آئی۔

"بیٹی تو لکشمی ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بیٹی تو دُوسرے سال بیٹا۔"

ماں دائی سے کہہ رہی تھی۔

"لڑکی ہے کہ ریشم کا دھاگا ہے . . . ." ماں کہہ رہی تھی یا دائی کہہ رہی تھی۔ اِس مرتبہ گوپال سے آواز نہیں پہچانی گئی۔ اُس کی کُرسی کانپی اور کُرسی کی وجہ سے ساری دیوار ہل گئی۔ اُسے محسوس ہوا وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ لالہ گوپال داس اور اُس کی بیوی اپنے گھٹنوں کو دباتی ہوئی کہہ رہی تھی "لڑکی اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ کوئی لڑکا دیکھو نا۔ کہاں چھپاؤں اِس آنچل کی آگ کو؟ ایسا رُوپ . . . اُوپر سے زمانہ بُرا ہے۔"

اور پھر جیسے اُس کے دروازے پہ بارات آ گئی۔ اُس کے داماد نے اُس کے پاؤں چھوئے۔ اُس کی بیٹی لال کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ڈولی کے پاس جا کر اُسے دِلاسہ دینے لگا . . . اُس کی بیٹی . . . . . . بالکل لال مرچ . . . .

لال مرچ . . . . لڑکی . . . . . لال مرچ . . . . . اور گوپال کو محسوس ہوا آج . . . . . آج کسی نے مرچیں اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھونک دی تھیں۔

تجارت کا سَوال

بندو کی ماں اپنے پیار کی شدّت کو ظاہر کرنے کے لئے ہمیشہ اُسے "بندی" کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ بندو کے ماتھے پر اُس کے تراشے ہوئے بال ایک جھالر کی شکل میں ہلتے رہتے تھے۔ اور اُس کی موٹی موٹی آنکھوں پر پلکوں کے لمبے لمبے بال چھوٹی چھوٹی جھالریں بن جایا کرتے تھے۔ اِن سیاہ جھالروں میں اُس کا گورا چِٹّا رنگ اور بھی کھِل اُٹھتا تھا اور ہونٹوں کا سُرخ رنگ اور گہرا سُرخ دکھائی دینے لگتا تھا۔

بندو کی ہم جماعت لڑکیاں ابھی جمع تفریق کے سوالوں تک ہی پہنچی تھیں کہ وہ ضرب کے سوال حل کرنے لگی۔ اگلی جماعت میں پہنچ کر جب وہ ضرب کے سوال حل کرنے لگیں تو بندو تقسیم کے سوالوں کی مشکل منزلوں میں سے گزر رہی تھی۔ اور پھر جب ان کے ناپختہ ذہن تقسیم کے سوالوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگے تو بندو بٹوں

کے سوالوں میں مہارت حاصل کر چکی تھی۔ اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے وہ ہر جماعت میں اُستانیوں کی منظورِ نظر بنی رہی تھی اور محبت کے جذبے کے تحت اُستانیاں بھی اُسے "بندو" کی بجائے "بندی" کے نام سے پکارنے لگی تھیں۔

سُریندر بندو کے مکان کے بالکل سامنے والے مکان میں رہا کرتا تھا۔ عمر میں وہ بندو سے تین چار سال بڑا تھا۔ دونوں گھروں میں کوئی خاص راہ و ربط نہ تھا۔ معمولی پڑوسیوں کے سے تعلقات تھے۔ ایک دِن سُریندر کی والدہ اُس کی ماں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ایک دم بندو سے کہنے لگی۔

"بیٹی تم ہمارے ہاں کبھی نہیں آتیں۔ کبھی کوئی سوال وغیرہ سمجھنا ہو تو ہمارے "سِندی" سے پُوچھ لیا کرو۔ ہمارا سندی حِساب میں بہت ہوشیار ہے۔"

سُریندر کی والدہ کی یہ بات بندو کے دِل میں گھر کر گئی۔ وہ اپنے مکان کی کھڑکی میں سے بجلی کی روشنی میں بیٹھے ہوئے سُریندر کو دیکھتی رہتی بار بار اُس کے ذہن میں خیال اُبھرتا۔

"کاش بٹوں کا یہ سوال غلط ہو جائے تاکہ میں اپنی کاپی لے کر سُریندر سے اس کا صحیح حَل سمجھنے جا سکوں۔"

بندو اپنے سوال انتہائی لاپرواہی سے حل کرتی۔ اِس غفلت کے باوجود جب وہ اپنا جواب حساب کی کتاب کے جواب کے ساتھ مِلاتی تو ہر مرتبہ اس کا جواب صحیح نِکلتا۔ جھنجھلاہٹ میں وہ کاپی اور پنسل میز پر پٹخ دیتی۔

وقت گزرتا گیا۔ نہ ہی کبھی بندو کے سوالوں کے جواب غلط ہوئے اور نہ ہی وہ اپنی کاپی سُریندر کے سامنے رکھ سکی۔ ایک روز اُس نے سُنا کہ سُریندر کی ٹانگ میں کھیلتے کھیلتے چوٹ آگئی ہے۔ سُریندر کی ٹانگ سے لگاتار خون بہے جا رہا تھا۔ صبح سے دو ڈاکٹر سریندر کی ٹانگ کا معائنہ کر چکے تھے بندو کی والدہ بھی سُریندر کے گھر مزاج پُرسی کے لئے ہو آئی تھی۔ بندو چاہتی تھی کہ وہ بھی جا کر ایک نظر سُریندر کو دیکھ آئے۔ لیکن اُس کی والدہ نے اُس سے ساتھ چلنے کے لئے پُوچھا تک نہیں۔ اگلے روز اُسے پتہ چلا کہ سُریندر کی ٹانگ میں شیشے کا ٹکڑا چُبھ گیا ہے۔ اُسے نِکلوانے کے لئے سُریندر کو ہسپتال میں داخل کرانا ہوگا۔

”چاند ایسا خوبصورت لڑکا ہے۔ ایشور نہ کرے اُس کے جسم میں کوئی کمی آئے۔“ ایک ہفتہ تک بِندو کے گھر اور پڑوس میں ایسی باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر سُریندر ہسپتال سے واپس گھر آگیا۔

بندو اپنے مکان کی کھڑکی میں سے پھر اُسے دیکھنے لگی۔ کبھی سُریندر کی ماں اُسے دَوائی پِلاتی ہُوئی نظر آتی۔ کبھی دُودھ۔ اور کبھی آہستہ آہستہ سُریندر کی ٹانگ کی مالش کرتی دِکھائی دیتی۔ سُریندر سارا دِن ساری رات کمبل اوڑھے چارپائی پر لیٹا رہتا

کچھ عرصہ بعد سُریندر کی پٹی کھول دی گئی۔ اب وہ بِستر سے اُٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر تھوڑا بہت گھومنے بھی لگ گیا تھا۔ بندو نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سُریندر کی بائیں ٹانگ قدرے لنگڑاتی ہے۔ اس حالت میں اُس کے لئے سکول جانا ممکن

نہ تھا۔ ماسٹر گھر پر آکر اُسے پڑھانے لگا۔ لگاتار کئی کئی گھنٹے وہ اپنے بِستر میں لیٹا ہُوا پڑھتا رہتا تھا۔ بندو نے سُنا کہ سُریندر کی ٹانگ کی کجی فی الحال کئی سال تک دُور نہ ہوگی۔ جوں جوں جسم میں طاقت بھرتی جائیگی، اُس کی ٹانگ ٹھیک ہوتی جائے گی۔

بندو سکول میں اب تجارت کے سوال کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا ہوگیا تھا اُسے، انتہائی کوشِش اور پُوری توجّہ کے باوجُود اُس کے ہر سوال کا جواب غلط ہو جاتا تھا۔ وہ دُوسری بار کوشِش کرتی۔ مگر پھر بھی صحیح جواب نہ آتا۔ آخر ایک دِن اُس نے اپنی ماں سے پُوچھ ہی لیا ”ماتا جی اگر آپ کہیں تو میں سُریندر سے سوال سمجھ آیا کروں۔“

سُریندر کا سکول جانا، کھیلنا کُودنا، غرضیکہ ہر قسم کی مصروفیات بند تھیں۔ بستر میں لیٹ کر متواتر کئی کئی گھنٹے پڑھتے رہنا اُس کا واحد شغل رہ گیا تھا۔ بندو کا اُس کے پاس سوال سمجھنے کے لئے آنا سُریندر کی محدود زِندگی میں ایک نئی وسعت پیدا کرنے کا مترادف تھا۔

بِندو اس وقت کا انتظار نہایت بے تابی سے کرتی جب وہ سُریندر کے پاس پڑھنے جاتی تھی، سُریندر بھی سارا دِن اُس کی راہ تکتا رہتا تھا۔ عمروں میں اضافے کے ساتھ ساتھ اُن کے انتظار میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

بِندو کی پیشانی سے اب بچپن کی یادگار تراشیدہ بالوں کی جھالر اُتر چکی تھی۔ اُس کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کالی

جھالر کی جگہ اس کے ماتھے پر جوانی کے جذبات کی ریشمی جھالر لہرا اٹھی تھی۔ جوانی نے اُس کے حُسن میں نیا رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا۔ ماں اب بھی پیار سے اُسے "بندی" کہہ کر پُکارا کرتی تھی۔ سکول کی استانیاں بھی ابھی تک اِس پیار بھرے نام ہی سے اُسے بُلاتیں۔ لیکن پتہ نہیں سُریندر کے ہونٹ اس سادہ سے لفظ میں کہاں سے اِتنی مٹھاس بھر دیتے تھے۔ جب بندو اُس کے مُنہ سے "بندی" کا لفظ سُنتی تو اُسے اپنی رُوح میں ایک شہد سا گھلتا محسوس ہوتا۔

پیار کے اِس خوشگوار اور میٹھے ماحول میں ڈوبے ہُوئے سُریندر اور بندو نے سُنا کہ بندو کی شادی ہونے والی ہے۔ بندو کے ماں باپ نے اُس کے لئے ایک نہایت لائق اور خوبصورت دُولہا پسند کیا تھا۔ یہ خبر سُن کر سُریندر نے اپنی آنکھوں سے بہہ رہے آنسوؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے بندو کے آنسو اپنے ہونٹوں سے چُوم کر کہا۔ "بندی جاؤ۔ آخر میرے پاس تمہیں خوش رکھنے کے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ میں ایک اپاہج ہُوں میری یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ شاید کبھی بھی ٹھیک نہ ہوگی۔ مجھ سے تو اپنا بوجھ بھی نہیں اُٹھایا جا رہا۔ تمہارا بوجھ کیسے برداشت کر سکتا ہُوں۔ میرے جیسا اپاہج تمہیں کیا کھِلائے گا۔ میری خواہش یہ ہے کہ تم شادی کر لو اور اپنی زِندگی آرام اور چین سے گُزارو۔"

ہچکیوں اور آنسوؤں کے ہجوم میں گھری ہوئی بندو کے گلے سے بمشکل تمام یہ الفاظ ٹُوٹ ٹُوٹ کر نِکلے "سندی۔۔۔۔ نہیں

نہیں۔۔۔۔ سندی مجھے یہ تجارت کا سوال نہیں آتا۔۔۔۔ نہیں آتا۔"
بندو کی بارات آ گئی۔ مگر بندو اور سُریندر دونوں غائب تھے۔ شادی کے گیت گا رہی ڈھولک ایک دم پھٹ گئی۔ حلوائیوں کی بھٹیوں پر یاس کا پانی پھر گیا اور بندو کی ماں کا آنچل اُس کے آنسوؤں کی آگ میں جل اُٹھا۔

۲

بندو ماں بننے والی تھی۔ سُریندر شہر میں ایک صابن بنانیوالے کارخانے میں ملازم تھا۔ اُنہوں نے ایک تنگ و تاریک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مگر بندو کے حسن کی تابانی اور فراخ دِلی نے اُس مکان کو لامحدود وسعت اور بے پناہ اُجالا بخش دیا تھا۔

کبھی کبھی بندو سُریندر سے محبت بھرا اصرار کرتی ہُوئی کہتی۔

"میرے ساتھ چار پھیرے تو لے لو۔ میرے ماتھے پر اپنے ہاتھوں سے سُہاگ کی بِندی تو لگا دو۔ نہیں تو یہ لوگ مجھے رکھیل کہیں گے، کوئی بھی مجھے تمہاری بیوی ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔۔۔ اور اب۔۔۔۔ اب تو۔۔۔"

سُریندر اس آدھی بات کا مطلب خُوب سمجھتا تھا، جو بندو کے جسم میں روز بروز بھرتا جا رہا تھا۔ ساری بات کو سمجھتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں وہ بندو کے سوال کو ہر بار ٹال جاتا تھا۔ اپنے دِل کی ڈھارس بندھانے کے لئے بندو خود ہی کہتی۔

"اچھا سندی۔۔۔۔ اپنی پیشانی کبھی میں خود ہی ہوں اور اپنی

بندی بھی۔ . . . . جیسے تم خوش ہو سکتے ہو اسی میں میری خوشی ہے۔"

پھر ایک خوشگوار تبدیلی رُونما ہوئی۔ سُریندر نے ایک کھلا ہوادار مکان کرایہ پر لے لیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی گھریلو ضرورت کی چیز گھر آنے لگی۔ بازار میں چیزوں کی قیمتیں ناقابل برداشت حد تک چڑھی ہوئی تھیں۔ اور ہر روز چڑھ رہی تھیں۔ پھر بھی وہ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز خرید لاتا تھا۔ بندو حیران تھی۔ جب بھی اُس نے سُریندر سے اِس معاملے میں بات کی تو وہ ہمیشہ ہنس کر کہا کرتا تھا۔

"میرے کام اور ایمانداری سے خوش ہو کر سیٹھ نے میری تنخواہ بڑھا دی ہے۔ تنخواہ کے علاوہ کارخانے میں میرا حصّہ بھی ہے۔ اب سب لوگ مجھے "چھوٹے شاہ جی" کے نام سے پُکارتے ہیں۔"

بندو یہ جواب سُن کر خوش ہو جاتی اور سوچتی

"کیا واقعی ہماری قسمت پلٹ چکی ہے۔"

مگر بندو کو یہ حیرانی تھی کہ جب اُس نے اپنا دِل کھول کر سُریندر سے محبت کی ہے تو پھر اُس کے دِل میں گھبراہٹ سی کیوں پیدا ہو رہی تھی۔ سُریندر پہلے بڑی نرم نرم باتیں کیا کرتا تھا۔ اب اِن باتوں میں ایک تناؤ سا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔

بندو کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا۔ اُس کی شکل ہو بہو سُریندر سے ملتی تھی۔ بچّے کو دیکھ دیکھ کر بندو سوچا کرتی "اپنی شکل کی سب دِل فریبی، سب خوبصورتی اپنے بیٹے کو سونپ کر اب خود مجھ سے پرے ہٹتے جا رہے ہو" دِل کے دامن کو وہ جس قدر مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھامنے کی کوشش کرتی، اُتنی ہی تیزی سے وہ اُس سے

چھوٹتا جا رہا تھا۔

بچے کا نام رکھنے کی رسم سُریندر نے خوب دُھوم دھام سے منائی۔ ایک نہایت ہی پُرتکلف اور وسیع پیمانے کی دعوت دی گئی۔ جس میں اُس کے کارخانے کے سب ساتھی اور دیگر بہت سے احباب نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر لکھنؤ کی ایک مشہور گانے والی طوائف بھی بُلائی گئی۔ بندو نے کہیں سے یہ سُن رکھا تھا کہ سُریندر اِن دِنوں شہر کی ایک گانے والی کے کوٹھے پر اکثر آتا جاتا ہے۔ بندو کے دِل میں شُبہ پیدا ہُوا کہ ہو نہ ہو یہ گانے والی لکھنؤ کی نہیں بلکہ وہی طوائف ہے۔ اور یہ دعوت کا سارا کھیل صرف اُسے گھر پر بُلانے کے لئے رچایا گیا ہے۔ بندو نے اپنے اِس شُبہ کو ظاہر نہ کیا۔

تین گھنٹے مردانہ میں مہمانوں اور صاحبِ خانہ کی طبیعت خوش کرنے کے بعد جب گانے والی جانے لگی تو گھر کی مالکہ کو، سُریندر کے بیٹے کی ماں کو سلام کرنے کے لئے بندو کے پاس آئی۔ بندو نے بٹوے میں سے پچاس روپے نکال کر اسے بطور انعام دینا چاہے۔ وہ روپے لوٹاتی ہوئی کہنے لگی۔

"آپ کیوں خواہ مخواہ تکلیف فرما رہی ہیں۔ اِس گھر کا دِیا تو میں روز ہی کھاتی ہوں۔ شاہ جی ہر روز کچھ نہ کچھ دے ہی آتے ہیں۔"

گانے والی کے یہ الفاظ بندو کے احساس خودداری پر پتھر کی طرح پڑے، اور وہ دِل میں سوچنے لگی "تو جو افواہیں میں نے سُنی تھیں وہ سچ نکلیں . . . . . یہ دعوت میرے بچے کی خوشی میں نہیں . . . . . یہ صرف اُس . . . . ." مگر بندو اپنے دِل کی ٹیس

کو دبا کر اور اپنا سر بلند کر کے کہنے لگی۔

"رکھ بھی لو بنو، شاہ جی تو تمہیں ہر روز روپے دیتے رہتے ہیں۔ مگر میرے ہاتھوں سے کب کب ملیں گے۔" اور پھر اُس نے نوٹ ردی کاغذوں کی طرح مسل کر گانے والی کے دامن میں پھینک دیئے۔

مہمان رُخصت ہو گئے۔ سُریندر اندر آیا۔ بندو کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر اُس نے روتے ہوئے پُوچھا "بندی میرے بندی۔ تم میرے ساتھ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"آخر تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ تمام گھر تمہارا ہے تم ایک بیٹے کی ماں ہو۔ دُنیا کے تمام سُکھ میں تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دیتا ہُوں۔ تمہیں اور کیا چاہیئے؟"

سُریندر نے خالص تاجرانہ لہجے میں اُس کے آنسوؤں کا جواب دیا۔ بندو کے آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

تمہیں کھو کر ان دُنیاوی سُکھوں کا میں کیا کروں گی۔ بندی تم جانتے ہو کہ تجارت کا سوال میں کبھی ٹھیک حل نہیں کر سکی۔ یہ مجھے نہیں آتا۔ . . . نہیں آتا۔"

۳

چند ماہ بعد کارخانے کے ایک آدمی نے بندو کو آ کر بتایا کہ سیٹھ نے سریندر کو غبن کے الزام میں گرفتار کرا دیا ہے۔ پچھلے کافی عرصہ سے سیاہ بختی کے جو کالے سائے بندو کے گورے چہرے پر اپنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ آج وہ اُسے چیل کی طرح جھپٹتے

ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ ان پرچھائیوں سے ڈر رہی تھی۔ لیکن اس اچانک حملے نے اس کی فطری کمزوری کو غصے میں تبدیل کر دیا۔ وہ سیاہ بختی کے ان کالے پروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مروڑ کر ان کی قوتِ پرواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتی تھی۔ اسی جوش کی حالت میں وہ کارخانے کے مالک سیٹھ کے پاس جا پہنچی۔ اور اس سے سُریندر سے ملنے کی درخواست کی۔ سیٹھ نے پولیس سے کہہ کر سُریندر سے اُس کی مُلاقات کا انتظام کرا دیا۔

بندو جانتی تھی سُریندر گناہ گار ہے۔ اُس نے غبن کیا ہے۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ایک بار اُس کے مونہہ سے اس کا اقبالِ جُرم سُننا چاہتی تھی۔ سُریندر کی حالت پر کٹے پرندے کی طرح تھی۔ ندامت کے احساس نے اُسے گردن جُھکانے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن اُٹھا کر کہنے لگا۔

"بندی۔ میرا خیال چھوڑ دو۔ میں اپنا انجام جانتا ہُوں۔ جاؤ . . . جس قدر روپیہ تم اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو لے جاؤ . . . . دُور یہاں سے بہت دُور . . . . مجھے اپنی موت مرنے دو . . . ."

بندو کے دِل میں جذبات کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ سُریندر سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے کچھ نہ کہا۔ حوالات سے اُٹھ کر سیدھی وہ کارخانے میں آئی اور سیٹھ جی کے پاؤں پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔

"سیٹھ جی اپنا تمام روپیہ واپس لے لو۔ میرے۔ میرے بھرے گھر میں تالا لگا دو میں اِن ہی تین کپڑوں میں شہر سے نکل جاؤں گی۔ مگر ایشور کے لئے میرے سُریندر کو رہائی دِلوا دو..... کسی طرح اُسے چھڑا دو..... مجھ پر ترس کھاؤ سیٹھ جی ....."

سیٹھ کی مکروہ ہنسی نے بندو کے دِماغ کو ماؤف کر دیا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے نمودار ہوئے اور اُس کا سارا جسم لرزنے لگا..... کمرہ گھوم گیا..... اور..... اور پھر اُسے کچھ پتہ نہ رہا کہ وہ کہاں ہے......

جب اُسے ہوش آیا تو اُسے محسوس ہوا جیسے کمرہ میں شراب کی لہریں اُبھر رہی ہوں، جن میں وہ ڈوبی جا رہی تھی۔ پاس ہی کھڑا ہوا سیٹھ اُسے ایک بھیانک کالا دیو لگ رہا تھا۔ مگر اُس کالے دیو نے اُس کے سُریندر کو اپنی قید سے رہا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بندی اِس وعدے پر اپنی تمام زندگی نچھاور کرنے کو آمادہ تھی۔ اُس نے شراب کی بڑھتی ہوئی لہروں اور سیٹھ کے بڑھتے ہوئے بازوؤں میں اپنے آپکو غرق ہو جانے دیا۔

رات اپنی گردن جھکائے، اپنے چہرے پر سیاہ ماتمی نقاب اوڑھے چلی گئی۔ دِن کی سفید روشنی میں بندو نے دیکھا کہ سُریندر حوالات سے چھوٹ کر اُس کے پاس آ گیا ہے۔ اور اُس کے بخار کی گرمی میں جلتے ہوئے ماتھے پر برف کی پٹیاں رکھ رہا ہے۔

۴

سیٹھ نے سُریندر کے خلاف غبن کا مقدمہ واپس لے لیا۔ بندو کے جسم کے علاوہ اُن کے گھر کا کُل سامان اور سُریندر کی نوکری بھی سیٹھ نے اپنے ہرجانے کے طور پر اُن سے وصول کر لی۔ سُریندر اور بندو وہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر میں جا بسے۔ مگر بندو کے مقدر کی تاریکی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے اور گہری ہوتی گئی۔ سُریندر اُس کے نام ایک خط لکھ کر خود نہ جانے کہاں چلا گیا۔ خط میں لکھا تھا۔

"تم اگر اپنے لئے نہیں تو کم از کم اس معصوم اور خوبصورت بچے کی جان بچانے کے لئے ہی واپس اپنے ماں باپ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ میں کسی اور شہر میں قسمت آزمانے جا رہا ہوں۔ اگر زندہ رہا تو ضرور واپس آؤں گا۔ اب..... کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

یہ خط پڑھ کر بندو نے اپنے دِل کے آئینے میں جھانکا۔ وہ حیران تھی کہ سُریندر کی شخصیت کا وہ کون سا دھاگا تھا جسے تھامتے ہوئے اُس نے ماں باپ سے، ساری دُنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا۔ اب اس موہوم سے دھاگے کے ٹوٹ جانے پر وہ کس مونہہ سے واپس اُن کے پاس جا سکتی ہے۔ لیکن پھر اُسے اپنے بچے کی بھولی بھالی شکل میں اس کا ایک نیا ڈولہا نظر آیا۔ اپنی محبت کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کی اُس نے اُس نئے دھاگے کے ساتھ گرہ لگائی۔ اور اس گرہ شدہ دھاگے میں بندھی ہوئی وہ ماں باپ

کے دروازے تک پہنچ گئی۔

ماں کے جسم میں سُلگ رہی انتڑیوں سے ابھی تک دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ بندو کو اپنی رُوح کی تمام تر جلن اور کوفت کے ساتھ کوس بھی نہ پائی تھی کہ بندو کی زندگی میں اماوس کی رات سے بھی زیادہ سیاہ دِن آگیا۔ اُس کا بچّہ بیمار ہوگیا۔ بندو کے غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے سینے کا دودھ بچّے کے نازک جسم میں داخل ہوتا رہا تھا۔ ایسے زہریلے دُودھ کو پی کر بچے کا تندرست رہنا ناممکن تھا۔ اور آخر اُس کلی نے پھُول بننے سے بہت عرصہ پہلے ہی ہسپتال میں سِسک سِسک کر اپنی جان دے دی۔

بچّے کی موت کے بعد، اُس بچّے کی موت کے بعد جس کی شکل میں سُریندر اپنے بچپن کی تمام معصُومیت اور خوبصُورتی کے ساتھ موجود تھا۔ بندو کے لئے زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ مگر موت بھی تو اتنی ہی بے مقصد تھی جتنی زندگی۔ اِس تیرہ و تار دوراہے پر کھڑی بندو نے زِندگی کا ایک تیسرا راستہ دیکھا۔ ہسپتال میں اُس کے بچّے جیسے دُوسرے بچّے بھی تھے جو اپنے نازک نازک اعضا کے ساتھ موت کے خلاف جدوجہد میں مصرُوف تھے۔ بندو کو اُن میں اپنے بچّے کی شکل نظر آنے لگی۔ وہ دیوانیوں کی طرح اُن کے چہروں کو تکتی رہی۔ اور پھر چند روز بعد بندو اپنے سیاہ مقدر کو نرس کے سفید لباس کے ذریعے چمکانے کی کوشش کرتی ہوئی دِکھائی دی۔

سُریندر کے ساتھ بھاگتے ہُوئے بندو نے اپنے ماں باپ

کا گھر رات کے اندھیرے میں، چھپ کر، چوری چوری چھوڑا تھا۔ مگر نرس کا سفید لباس زیب تن کرنے کے لئے اندھیرے میں چوری سے بھاگنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہسپتال کی میٹرن نے اُسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ اور اُس نے اپنے دِن، اپنی نیندیں، اپنی راتیں، اپنے خواب سَب کچھ مریضوں کو سونپ دیا۔

سال گزرتے گئے۔ بندو کے لئے زِندگی کا مقصد ایک مرتبہ ختم ہوچکا تھا۔ لیکن جب وہ دُوسروں کے لئے جینے کے راز سے واقف ہوئی تو اُس کی زِندگی دوبارہ معنی آفرین بن گئی۔ بندو کے خلوص، محبت سے بھرے ہوئے رویّے نے اُسے مریضوں میں نہایت ہر دل عزیز بنا دیا۔ اُسے دیکھنے میں اُن کے چہروں پر آس اور صحت کی منوّر کرنیں رقص کرنے لگتیں۔

ہاں . . . . جس روز بندو کے بھائی نے اُسے اخبار سے پڑھ کر یہ خبر سُنائی کہ کان پور میں پولیس نے ایک مکان سے جعلی سکّے بنانے والا گروہ گرفتار کیا ہے۔ ان کا سرغنہ سریندر بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اُس دِن مریضوں نے دیکھا کہ تھرما میٹر لگاتے وقت بندو کے ہاتھ بید مجنوں کی طرح کانپ رہے تھے۔

میٹرن جس کی وساطت سے بندو نے زندگی کی کھوئی ہوئی خوبصورتی دوبارہ حاصل کی تھی۔ ایک بردبار، نیک سیرت با محبت مسیحی خاتون تھی۔ بندو کے کانپتے ہاتھوں کو اُس نے گورے گورے نرم و نازک ہاتھوں میں لے کر خداوند کریم سے دُعا مانگی کہ وہ اپنے بیٹے کی محبت کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس دُکھیاری کے دِل کو سکون

کامل عطا فرمائے۔ میٹرن کے خلوص اور ایمان پرستی نے بندو کے رجحان کو بھی خدا کی عبادت کی طرف راغب کیا۔ بندو جب ایک مریض کی چارپائی سے چل کر دوسرے کی چارپائی کی طرف جاتی تو پہلے مریض کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نہ صرف بیماری اور دُکھ کے کانٹے چُن کسے گئی ہے، بلکہ صحت اور مسرت کے خوبصورت پھُول بھی بانٹ گئی ہے۔

ایک رات بندو ڈیوٹی ختم کر کے جب گھر لوٹی تو اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی اُس کے دروازے کا سہارا لئے بیٹھا ہے۔ ٹارچ جلا کر دیکھنے کے باوجود وہ اُسے پہچاننے سے قاصر رہی۔ اس ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھال کی باریک سی تہہ کے علاوہ گوشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اُس نے ایک پھٹا پُرانا میلا سا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔

ٹارچ کی تیز روشنی نے اُس کی بند آنکھوں کو کھُلنے پر مجبور کر دیا۔ اور "بندی" کہہ کر اس کے تھرکتے ہوئے ہونٹ پھر بند ہو گئے۔

"بندی" اِس مختصر سے لفظ نے بندی کی رُوح کو جھنجھوڑ ڈالا۔ یہ لفظ جیسے اُس کے کانوں میں جم کر رہ گیا ہو۔ اس لفظ میں خدا جانے رُوحوں کی کون سی مشترک خاصیتیں ڈھلی ہوئی تھیں۔ بندو کو یوں محسوس ہوا کہ یہ اشتراک اس کے رُوئیں میں جم گیا ہے۔ وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔

"بندی۔ ۔ ۔ بندی۔ ۔ ۔ ۔ بندی" حالانکہ سُریندر کی آنکھیں اور ہونٹ بند تھے۔ لیکن پھر بھی اس کا کہا ہُوا ایک لفظ بار بار بِندو

کے ذہن سے ٹکرا رہا تھا جس نے بِندو کے اعضا میں یہ سویا ہُوا اشتراک جگا دیا تھا۔ وہ آواز اُس کے کانوں میں پگھلتے ہوئے سیسے کی طرح ڈھلنے لگی۔ پھر کسی غیبی قوت نے اُس کے مفلوج اعضا میں حرکت پیدا کی۔ اُس نے سُریندر کو سہارا دیکر اُٹھایا۔ کمزوری کی وجہ سے سُریندر کی ٹانگ کا نقص پھر اُبھر آیا تھا سہارے کے بغیر اس کے لئے ایک قدم بھی چلنا دُوبھر تھا۔ بندو نے اُس کا سُوکھا ہُوا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا اور دُوسرے ہاتھ سے اُس کی کمر کو سہارا دیکر آہستہ آہستہ اُسے کمرے میں لے آئی۔ چارپائی پر لیٹتے ہی سُریندر نے بندو کا ہاتھ اپنی روتی ہوئی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"لوگ کہتے ہیں اب تمہاری رُوح کو سکون مِل گیا ہے۔ میں پھر تمہیں دُکھی کرنے کے لئے آ گیا ہُوں۔ لیکن تم ہی بتاؤ، میں اور کہاں جاؤں۔ اب اور کسی دروازے پر تو مجھے موت بھی نہ آئے گی بِندی۔"

بندی کو یوں محسوس ہُوا جیسے اُن کی دونوں کی عمروں میں ایک دم کمی واقعی ہو گئی ہو۔ اُس کے سامنے سُریندر چارپائی پر لیٹا ہُوا پندرہ برس کا لڑکا بن گیا۔ جس کی ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور خود وہ بارہ برس کی "بندی" جو سُریندر سے کہہ رہی ہو "مجھے تجارت کا سوال نہیں آتا۔"

اور پھر جب ننھے ہاتھوں سے کاپی سُریندر کے سامنے رکھنے لگی تو سُریندر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، جیسے وہ ہمیشہ پکڑا کرتا تھا۔ بِندو نے گھبرا کر دیکھا۔ بڑے بڑے، ہڈیوں کے سے ہاتھوں نے اُس کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ اور سُریندر

کہہ رہا تھا۔

"بندی۔ تمہارے پاس آکر میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ یہ جانتے ہُوئے بھی میں تمہارے پاس آگیا ہوں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ تم سے دُور رہ کر میں مر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے آنے کی وجہ سے تمہارا سب سکون، سب شانتی جاتی رہے گی۔"

بندو نے سُریندر کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سندی تمہیں کھو کر بھلا مجھے سکون حاصل ہو سکتا ہے تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ تجارت کا سوال مجھے نہیں آتا۔۔۔ مجھے کبھی نہیں آئے گا۔"

چھوٹی عُمر میں بندو کے ماتھے پر تراشیدہ زُلفیں ایک جھالر سی بن کر لہراتی رہتی تھیں اور اس کالی جھالر میں اُس کا گورا چِٹا چہرہ اور اُبھر اُبھر کر نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتا تھا۔ پھر جوانی نے جذبات کی ریشمی اور رنگین جھالر اُس کے ماتھے پر لہرانی شروع کی تھی۔ اس نئی جھالر میں بندو پہلے سے کئی گُنا خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔

لیکن آج جب بندو نے افلاس، بیماری اور گناہوں کے بار تلے دبے ہوئے سُریندر کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھے، تو اس کی حسین و جمیل پیشانی پر شانتی کی، سکون کی سفید کرنیں ایک نئی جھالر بن کر لہرانے لگیں۔

اِس نئی جھالر والی بندو پہلی دونوں جھالروں والی بندوؤں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

ہڈیاں اور پھول

وہی پٹھانکوٹ سے ڈلہوزی جانے والی سڑک تھی۔ وہی راج تھا اور وہی راج کی کار تھی۔ لیکن آج راج کے بائیں طرف لال جوڑا پہنے ہوئے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ پچھلے مہینے راج کی شادی ہوئی تھی۔ اور آج سے تین برس پہلے جب راج اِس راستے سے گزرا تھا، اُس کے ساتھ اُلو بیٹھی ہوئی تھی۔ الو نے راج کے ساتھ صرف ایک دِن کے لئے سفر کیا تھا۔ اور اس لال جوڑے والی نے زندگی بھر ساتھ سفر کرنا تھا۔ راج سوچ رہا تھا، کِتنا اچھا ہو اگر ساری زندگی کے سفر میں وہ اس لڑکی کی رُوح کی گہرائیوں میں بھی اتنا ہی اُتر سکے جتنا اس ایک رات میں وہ اُلو کو سمجھ سکا تھا۔

تین برس بیتے، قِسمت کے ایک اِشارے نے راج اور اُلو کو ایک دِن کے سفر کے لئے اکٹھا کر دیا تھا۔ راج اپنی گاڑی میں ڈلہوزی جا رہا تھا، اور پٹھانکوٹ سے گزرتے ہوئے موٹروں کے اڈے پر اُس نے الو کو پہچان لیا تھا۔ امرتسر سے شاید وہ ریل میں آئی تھی اور اب دوپہر کو ڈلہوزی جانے والی آخری بس کا انتظار کر رہی تھی۔ راج نے اپنی گاڑی روک لی اور اُلو نے ڈلہوزی تک راج کی کار میں جانا منظور کر لیا تھا۔

اِس سے پہلے راج نے اُلو کو صرف ایک بار دیکھا تھا کِسانوں کے ایک جلسے میں الو گا رہی تھی اور راج سامعین میں بیٹھا تھا۔ پھر جلسے کے صَدر نے چائے پیتے وقت راج کا الو سے تعارف کرایا تھا۔ اس بات کو بیتے ہوئے ایک برس ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی تک راج کے بدن میں الو کی یاد خلش بن کر ایک ٹیس پیدا کر دیتی تھی۔ راج نے الو کو کبھی اپنی دُنیا کی شے تصور نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس پورے ایک برس میں اُس نے ایک دفعہ بھی اُلو سے مِلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اِس خلش کو وہ اپنی ذاتی شے سمجھتا تھا۔ اپنے لہو و گوشت میں سے ظہور میں آئی ہوئی شے، اور اِس لئے وہ اپنے اکیلے پن کے دِنوں میں کئی مرتبہ اسے اپنے بدن میں محسوس کر لیتا تھا۔ اور پھر پچھلے برس الو کے نام کو اور بھی شہرت نصیب ہوئی تھی، چین جانے کے لئے جب ہندوستان کے کچھ فنکار چنے گئے تو پنجاب کی طرف سے اُلو کو منتخب کیا گیا تھا۔

الو کے پنجابی گیتوں کو چینی دوشیزاؤں نے سیکھا، اور ملک

کے چوٹی کے اخبارات نے انتہائی فخر کے ساتھ انو کی تصاویر شائع کیں۔ اس طرح انو کو مزید شہرت ملی تھی۔ اور راج کو اُس سے ملاقات کرنے میں اور بھی ہچکچاہٹ اور جھجھک محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ راج نے پٹھانکوٹ کے بسوں کے اڈّے پر اُنو کو پہنچان لیا تھا۔ اور اُنو نے ڈلہوزی تک راج کی گاڑی میں جانا منظور کر لیا تھا۔

پٹھانکوٹ سے کافی میل دُور نکل جانے کے بعد معلوم ہوا کہ پچھلے تین دِنوں کی لگاتار بارش کی وجہ سے اچانک آگے سڑک ٹوٹی ہوئی تھی اور تقریباً بیس مزدور کدال اور بیلچے کر سڑک کی مرمت کے لئے جا رہے تھے۔ راج کی گاڑی کھڑی ہو گئی۔ آنے والی شام ضرور ڈوبتے سورج کی کرنوں سے رنگین اور حسین ہوگی۔ اور پھر سر پر پھیل رہی رات جنگلی پھولوں کی خوشبو میں بھیگی ہوئی ہوگی۔ لیکن وہ رات کس چھت کے نیچے بسر ہونی تھی۔ اس کا دونوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا۔ راج نے سوچا واپس پٹھانکوٹ ہی لوٹ چلیں اور وہیں رات گزار دیں۔ بائیں طرف پہاڑ کے قدموں میں سمٹی ہوئی چائے کی ایک دُکان تھی۔ واپس جانے سے پہلے راج نے دکاندار سے چائے تیار کرنے کے لئے کہا اور جتنی دیر میں چائے تیار ہوتی، اتنی دیر پہاڑ کے اوپر کی طرف بڑھ رہی ایک پگڈنڈی کی سمت اس نے قدم بڑھائے انو گاڑی میں بیٹھی رہی۔

انو کی بغل میں بیٹھے ہوئے راج کے دِل میں جیسے ایک ہلکی ہلکی پھوہار کے نرم و نازک چھینٹے گرتے رہے تھے اور بھیگے اور دُھلے

من سے اب کہیں سجدہ کرنے کو اس کی طبیعت مچل رہی تھی۔

اس کے قدموں کے آگے بچھی ہوئی پگڈنڈی ایک جگہ پر دو حصّوں میں منقسم ہو گئی تھی اور جس سمت سے پانی سے بھرے نالے کی آواز آ رہی تھی اس کے قدم اس جانب گھوم گئے۔ پہاڑ کی بغل میں ایک نالہ ایک اُونچی چھلانگ لگا کر نیچے گرتا تھا۔ نالے کے کنارے پر بمشکل ایک بالشت بھر ہموار جگہ تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوڑی پیٹھ تھی۔ اور وہ ہموار جگہ اس پیٹھ کے نزدیک بنی ہوئی ایک دہلیز پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ راج کو اس دہلیز نے جیسے آواز دے کر بُلا لیا اور اُس دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی راج کو ایسا لگا جیسے آج ایک کرامات جیسی کچھ بات ہو گئی تھی۔

وہ دہلیز ایک پہاڑی مندر کی دہلیز تھی۔ ایک بڑی چٹان نے جیسے اپنے سینے میں اس مندر کو جگہ دی ہوئی تھی۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے یہ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے کسی کو خواب میں اس مندر کا گمان نہیں ہو سکتا تھا اندر شیو اور پاربتی کی کچھ مورتیاں تھیں۔ جو اس وسیع کالی چٹان کو تراش تراش کر بنائی ہوئی تھیں اور جن پر قطرہ قطرہ بن کر پانی ٹپک رہا تھا۔ چٹان کے سامنے پھیلے ہوئے ایک بڑے درخت کی ٹہنیاں مندر کی چھت کے ساتھ زور سے لپٹی ہوئی تھیں۔ جن کا رنگ پانی سے بھیگ بھیگ کر لوہے کے رنگ جیسا ہو گیا تھا۔

راج کا سر جُھک گیا۔ شیو سے، پاربتی سے، یا اور کسی بھی دیوی دیوتا سے اُسے کوئی دیرینہ محبت نہ تھی۔ لیکن آج راج کو یوں محسوس

ہوا کہ کیا مُورتی کے پتھر اور کیا معمولی پتھر سبھی جیسے دیوتا بن گئے تھے۔ اور اس کے دل میں پُوجا کا ایک گہرا اور سنجیدہ جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس پُوجا کے لئے کوئی ایک دیوتا سامنے نہیں تھا۔ لیکن راج کو یوں لگا آخر ماتھے ہی تو دیوتاؤں کو جنم دیتے ہیں۔ کرامات دیوتاؤں کی نہیں ہوتی ہے۔ سجدہ کرنے والے ماتھے کی ہوتی ہے۔ اور آج اُسے اپنا ماتھا بڑا پاک اور خوبصُورت لگا۔ اُسے ذرّے ذرّے میں دیوتا بن جانے کا گُمان ہوتا ہے۔

پانی قطرہ قطرہ بن کر راج کے سر پر، موہنہ پر اور بدن پر گر رہا تھا نہ معلوم کتنا وقت بیت گیا۔ پیروں نے لوٹنے سے اِنکار کر دیا اور جسم کے انگوں کی ٹھنڈک میں سے راج کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی ابھی ایک مُورتی بن جائے گا اور شیو کے پاس، پاربتی کے قریب اُس کا بُت بھی کھڑا رہے گا۔ اس نے ایک بار باہر کی دُنیا کے بارے میں سوچا۔ پر اُسے لگا جیسے کسی نے بھی اُسے آواز نہ دی ہو۔ اور اب وہ وہیں کھڑا رہنے کے لئے تیار تھا۔ برسوں کے لئے . . . . . صدیوں تک . . . . .

دائیں کندھے کے قریب راج کو یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے گرم اور زندگی کی حرکت سے بھرپُور سانس لیا ہو اور راج نے دیکھا انو اُس کی بغل میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر سے کھڑی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ بُوند بُوند گر رہے پانی میں وہ پُوری طرح بھیگی ہُوئی تھی۔ دونوں نے اس مندر کے جادُو کو اپنے اندر بھرا ہُوا پایا۔ اور دونوں کی نگاہوں میں ایک اطمینان تھا۔

پھر پجاری آیا۔ سر سے لیکر پیر تک اُس نے ایک اُونی چغہ پہنا ہوا تھا۔ اُس نے ایک جنگلی پھُول شیو کی مُورتی سے چھُوا اور پھر آدھا آدھا پھُول دونوں میں بانٹ دیا۔ "بچّہ، من میں پُوجا کرو۔ جو مانگو گے ماتا پاربتی دے گی۔"

راج کو محسوس ہوا عام پجاریوں جیسی اُس کی آواز نہیں تھی۔ پتھروں کی گُونج میں سے جیسے ایک شیریں اور پُرکیف صدا آئی تھی۔ انو نے اپنے حِصّے کے آدھے پھُول کو ہتھیلیوں میں دبایا اور مندر سے باہر آگئی۔ انو جیسے باہر کی دُنیا کی آواز تھی۔ جس کے پیچھے راج کو بھی مندر سے باہر آنا پڑا۔

راج اور انو نے جب چائے پی لی اور وہ واپس پٹھانکوٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے تو پُجاری نے پہاڑ کی پگڈنڈی کے نیچے سڑک کی طرف اُترتے ہوئے اُنہیں ٹھیرنے کا اِشارہ کیا۔ مکی کی گرم روٹی، اُبلے ہوئے چاول اور اُڑد کی دال تھالی میں رکھ کر پجاری اُن کے لئے لا رہا تھا۔

"دیوتا کا پرشاد" اور پُجاری نے تھالی راج کے سامنے رکھ دی پُجاری میں پجاریوں جیسا غرُور نہیں تھا۔ راج میں بھگتوں جیسا یقین نہیں تھا۔ دونوں جیسے ایک جگہ کھڑے تھے اور اُس جگہ کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں زِندگی حسین دکھائی دیتی ہے۔

"آپ چاہیں تو رات میری کوٹھری میں رہ سکتے ہیں۔"

"نہیں ہم آپ کو اتنی تکلیف نہیں دیں گے۔"

"میرے پاس دو چھوٹی کوٹھریاں ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو ایک دے سکتا ہوں۔"

پٹھانکوٹ واپس جانے کے لئے راج اور انو کو کوئی اشتیاق نہیں تھا۔ اُس چھوٹے سے شہر کے کسی ہوٹل کا کمرہ بھی اتنا ہی بیگانہ تھا جتنی اس مندر کی کوٹھری

راج اور انو نے اپنا اپنا بستر پجاری کی کوٹھری میں رکھ دیا۔

سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ پانی کی سفید دھار پہلے سنہری رنگ کی ہو گئی پھر رنگوں کی دِل کشی بھی جاتی رہیں۔ شام اور گہری ہو گئی اور پانی کی آواز مزید اونچی اور وسعت پذیر ہو گئی۔ اِتنی اُونچی اور وسعت پذیر۔ جس کے سامنے اِنسانی دِل کی نحیف اور ننھی ننھی آوازوں کا کوئی وجود نہ رہ گیا ہو۔

انو اور راج کو یہ سب کچھ بہت ہی قدرتی لگا۔ اُن کے چہرے پر خوف کی کوئی لکیر نہ تھی۔ اور ایک دُوسرے کی طرف سے اِتنی تسلی اتنا یقین دونوں کو بڑا ہی خوبصورت لگا۔ پتھر کے چھوٹے ریزوں سے اور پانی کے چھینٹوں سے کھیل کھیل کر اُنہوں نے شام کو اور گہرا کر لیا

جب رات کی اولیں تاریکی میں سے چاند کی روشنی پھُوٹ نکلی، اور جاڑے کی گہری کپکپی نے جب اُن کے بدن کو جھنجھوڑا، تو وہ پانی کے کنارے کو چھوڑ کر کوٹھری کی چھت کے نیچے آ گئے۔

دُور کونوں میں دونوں نے چارپائیاں بچھا لیں۔ راج کے بستر میں گتے لٹے کی ایک کتاب تھی۔ دیئے کی کانپتی لَو میں بیٹھ کر کتنی ہی جگہوں

سے وہ انو کو کتاب سناتا رہا۔ کتاب میں ایک جگہ ایک مطربہ لڑکی کا ذِکر آتا تھا۔ وہ پیانو بجاتی ہے، اس کا مصوّر دوست قریب ہی بیٹھا سُن رہا ہوتا ہے۔ اور پھر پیانو کے سُروں میں خواب بیدار ہوتے ہیں . . . . پھر راج اور انو کو یوں لگا جیسے آج کی رات گتے لٹے کے ناول والی رات تھی۔ اور دونوں ان خوابوں کی گرفت سے کانپ گئے۔

تُو اور 'آپ' کا فرق نہ جانے کب کس وقت مٹ گیا تھا۔ انو نے رات کے جادُو کو اپنے بدن سے دُور پھینک کر پُوچھا "راج تمہیں نیند نہیں آئی؟"

"ابھی نہیں"

دونوں خاموش رہے پھر خوابوں نے ایک لپیٹ میں کس لیا۔

راج نے پُوچھا۔ "انو حُسن کی انتہا تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ فن کا بھی کوئی اختتام نہیں ہوتا۔ لیکن پچھلے برس مجھے یوں لگتا تھا جیسے جو کچھ میں نے تمہارے گیت میں سُنا تھا ویسا کبھی کہیں نہیں سُنا تھا۔"

"ہمیشہ تو نہیں لیکن کبھی کبھی مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے اپنے کسی گیت میں اپنی کسی چیز کو مرنے سے بچا لیا ہو۔"

"انو، جب مندر میں پجاری نے کہا تھا، بچّہ پُوجا کرو، اور جو مانگو گے ماں پاربتی دے گی، اُس وقت تُو نے کیا مانگا تھا؟"

"کچھ نہیں"

"کچھ بھی مانگنے کا خیال نہیں آیا تھا؟"

"میں بیچاری پاربتی کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

"انو"

انو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ راج کی تمام چارپائی روشندان سے آتی ہوئی چاندنی میں شرابور تھی۔ اور اس چاندنی میں راج نے جیسے اپنے دِل کو پہلی مرتبہ دیکھا، اور جو کچھ اُسے اپنے دل میں دِکھائی دِیا۔ اسے اب وہ کسی سے چاہے چھپا لیتا، لیکن اپنی آنکھوں سے نہیں چھپا سکتا تھا۔

"انو تم نے زندگی میں کبھی پیار کیا ہوگا؟"

"ہاں"

"پھر"

"دِل کے سوا دُنیا کی ہر شے ہماری الگ الگ تھی۔ اِس لئے ہمیشہ الگ الگ ہی رہی۔"

"بہت دِن ہو گئے؟"

"ہاں کئی برس"

"وہ اب کہاں ہے؟"

"سنتی ہوں بہت دُور ہے۔ بڑی رنگین دُنیا میں۔ جہاں میری رسائی نہیں۔"

"دِل میں بھی دُوری آجاتی ہے انو؟"

"ہاں"

"کب تک؟"

"جب تک اُس کی بہت ہی شیریں اور بہت ہی کڑوے پانی کی پیاس نہیں مِٹ جائے گی۔"

"عورت کے دِل کو سمجھنا شاید بہت ہی مشکل ہوتا ہے انو"

"معلوم نہیں کیوں مجھے کلیر کی یاد آئی ہے۔ کلیر نے کچھ مہینے بائرن کے ساتھ گزارے۔ اور پھر تمام عمر شادی نہ کی۔ اس کی اور بائرن کی ایک بچی بھی تھی۔ وہ بچی بھی مر گئی۔ بائرن بھی مر گیا۔ اور جب کلیر اسی برس کی ہو گئی، ایک مصنف اُس سے ملنے کے لئے گیا، وہ بائرن کی زندگی لکھنا چاہتا تھا۔ اور کلیر نے اُسے زِندگی کی سب سے بڑی سچائی بتائی" میں بائرن کے متعلق زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ میں نے اسے پیار نہیں کیا۔ میری اور بائرن کی ایک بچی ضرور ہوئی تھی۔ اور اوائل عمر میں ہی اِٹلی کے ایک کانونٹ میں اُس کی وفات ہو گئی تھی" مصنف کو شیلے کی زندگی بھی لکھنی تھی۔ اور اسے یہ معلوم تھا کہ کلیر شیلے کی بیوی میری کی بہن تھی اِس لئے اس نے کلیر سے شیلے کے بارے میں کچھ پوچھا۔ اسی سال کی عمر میں کلیر کے مونہہ پر جوانی لوٹ آئی۔ مصنف نے حیران ہو کر پوچھا "کلیر تم شیلے سے پیار کرتی تھیں؟" اور کلیر نے جواب دیا "دِل اور رُوح کے ساتھ"

کلیر کی کہانی ختم ہو گئی۔ انو اور راج دِلوں کی تہوں میں کھو گئے۔

"انو ا غم میں بھی ایک نشہ ہوتا ہے۔ اور جب کسی کو اس کی عادت پڑ جائے وہ انتہائی کوششوں سے بھی بِکھرے غموں کو اکٹھا کر لیتا ہے"

"شاید"

"انو میں یہ نہیں کہتا کہ تم کسی کو بھول جاؤ۔ لیکن بادل کے ایک ٹکڑے سے تمام سُورج کو روکے رکھنا چاہیئے؟"

"اندھیرے میں رہنے کی شاید مجھے عادت ہو گئی ہے۔ مجھے یہ

اچھا لگتا ہے"

"اگر اس تاریکی میں وہ پھر لوٹ آئے. . . . ."

"وہ . . . "

اور کتنے ہی لمحات کی خاموشی کے بعد راج نے اُٹھ کر انو کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ انو کا تمام چہرہ آنسوؤں سے گیلا تھا۔

بیس قدموں کی دُوری پر گر رہے پانی کی آواز اور جنگلی پھولوں کی خوشبو جیسے چاندنی میں بھیگ کر آ رہی تھی۔ راج کے گرم چوڑے اور جوان ہاتھوں نے انو کے ہاتھوں کو دبایا۔

"رات بڑی خوبصورت ہے" راج کا سانس انو کے ماتھے کو چھو گیا۔

"اور اس لئے مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی"

"انو"

"کیا دُنیا میں "وجہ" ہی سب کچھ ہے"

"وجہ کی تسلی کے لئے بھی وجوہات ڈھونڈھی جاتی ہیں"

"مجھے وجوہات کے سہارے کی ضرورت نہیں"

"پھر مجھ سے بھی وجہ پوچھنے کے لئے سوال نہ کرنا۔ لیکن انو زندگی کے باقی برس اگر میں تم سے مانگ لوں؟"

"راج . . ." انو کے سانس میں سینکڑوں خوشبوئیں تحلیل ہو گئیں۔

لیکن انو نے خوشبوؤں کا جیسے گھونٹ بھر کر کہا "راج میرے پاس اب دینے لائق کچھ نہیں ہے"

"برسوں سے برس بدل لو انو! میری زندگی سے زندگی بدل لو"

"اتنے حسین دل کے بارے میں میں کیا دُوں گی؟"

"مجھے بدلے میں کچھ نہیں چاہیئے انو"

انو نے اپنا چہرہ راج کی چوڑی اور سفید ہتھیلیوں میں رکھ دیا۔ اور انو کے آنسوؤں کا جیسے بندھ ٹوٹ گیا۔

"راج تمہیں معلوم ہے اس وقت میرے دل میں کیا خیال آیا ہے؟"

"جو کچھ بھی آیا ہے ٹھیک ہوگا"

"لیکن تمہیں شاید اچھا نہ لگے"

"انو جو کچھ تمہیں اچھا لگتا ہے، مجھے بھی اچھا لگے گا"

"راج وہ تم سے اچھا نہیں ہوگا، پر میرے دل میں یہ آیا ہے کاش آج کے اس سفر میں تمہاری جگہ پر اگر وہ ہوتا. . . ."

راج نے جھٹ سے انو کا ماتھا چوم لیا اور پھر انو کی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا "تمہاری سچائی کو میں پیار کرتا ہوں انو"

"روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی مشکلات میں شاید برداشت نہیں کر سکتی، لیکن "ٹریجیڈی" جیسی بڑی بات میں برداشت کر سکتی ہوں"۔

پھر ایک مرد اور ایک عورت ہوے کا راز دونوں بھول گئے

اپنا دایاں بازو انو کے سرہانے پر رکھ کر راج تمام رات چارپائی کی پٹی پر بیٹھا رہا۔ نیند نے ایک لمحہ بھی نہ اُن سے چھینا اور وہ ساری کی ساری رات ان کے حوالے کر دی۔ اور پھر پورب نے رات کے چاروں کناروں میں کرنیں باندھ دیں۔

صبح کی اوّلیں سنہری کرنوں میں راج اور انو نے اُٹھ کر کچھ جنگلی پھول توڑے اور پھر مندر کی دہلیز پار کی۔ بوند بوند گر رہا پانی

انہیں ایسا لگا جیسے دیوی کی مہر برس رہی ہو۔ یہاں اُنھوں نے ایک دُوسرے کو ڈھونڈا تھا۔ اُنہیں لگا جیسے ہر ایک پتھر آج دیوتا بن گیا ہو، اور اُنھوں نے پھُولوں سے بھری ہُوئی مٹھیاں چاروں طرف بکھیر دیں۔

انو کے کاندھے کے پاس جُھک کر راج نے ایک گہرا سانس اپنے اندر کھینچا، انو کے بھیگے ہُوئے بدن کی خوشبو اُس میں ملی ہوئی تھی، اور راج کو یُوں محسوس ہوا جیسے وہ دونوں زندگی کے ایک بیش قیمت پھُول تھے لیکن دونوں ایک ہی زمین پر اور ایک ہی موسم میں پروان نہیں چڑھ سکتے تھے۔

صبح کے سفر میں ایک جگہ راج کی گاڑی بمشکل ٹکّر سے بچی، اور جس وقت گاڑی اُلٹنے لگی تھی، انو نے زور سے راج کا بازُو تھام لیا تھا "مجھے آج موت سے خوف نہیں آ رہا" اور راج تے انو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھینچ کر کہا "موت کبھی اتنی حسین نہیں ہو سکتی"۔

جو کچھ انہوں تے ایک دُوسرے سے حاصل کیا تھا، نہ اُس سے مزید حاصل کیا جا سکتا تھا، اور نہ وہ حاصل کیا ہوا کبھی گُم ہو سکتا تھا۔ اِس لئے پھر راج اور انو کبھی نہ ملے۔

آج جب راج کی گاڑی مندر کے موڑ کے قریب سے گُزری تو راج تے گاڑی روک لی اور اپتے پاس بیٹھی ہوئی لال جوڑے والی لڑکی سے کہا "پانچ منٹ میرا انتظار کرو گی؟"

"میں ساتھ آؤں؟"

"نہیں"

راج نے اپنے شہر سے سنبھال کر اپنے ساتھ لائے ہوئے موتیا کے پھُول نکالے اور پہاڑ کی پتلی پگڈنڈی پر چڑھتا ہُوا اوجھل ہو گیا۔

اور جب کچھ منٹ بعد راج واپس آیا تو اُس کی بیوی نے پُوچھا "وہاں کیا تھا؟"

"ایک مندر"

"آپ نے پھُول چڑھائے ہیں؟"

"ہاں"

راج تے پھر رُک کر کہا "جب انسان مر جاتے ہیں، اُس کی ہڈیوں کو کیا کہتے ہیں؟"

"پھُول"

"تم ایک بات یاد رکھو گی؟"

"رکھوں گی"

"جب میں مر جاؤں، میرے پھُول یہیں چڑھا جانا۔"

بیوی تے سہمے ہوئے چہرے سے ایک بار راج کی طرف دیکھا راج کے چہرے پر ایک مرد کا وہ حُسن تھا جو ہزاروں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتا ہے۔ اور راج تے مُسکرا کر کہا "اِس مندر پر وہ پھُول بھی چڑھائے جاتے ہیں"

چاندنی رات

شمّی میری چھوٹی بہن کا نام تھا۔ وہ محض چوبیس گھنٹوں کے لئے میری بہن تھی۔ کل سہ پہر اُس نے میرے ساتھ یہ رشتہ استوار کیا تھا اور آج دوپہر یعنی ابھی ابھی جب میں نے ڈاکٹر سین کے ہسپتال میں فون کیا تھا تو کوئی کہہ رہا تھا "شمّی؟ کون شیاما؟ اچھا تو آپ کی مُراد مسز راجیش سے ہے... مسز راجیش کا تو انتقال ہوگیا ہے۔ یہی کوئی ایک گھنٹہ ہوا....."

کل یہی وقت تھا، دوپہر کا، جب میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی اور کسی نے پُوچھا تھا "فائیو وَن فائیو نائن فائیو"

"جی ہاں"

"امرتہ پریتم؟"

"جی ہاں"

"دیدی!"

"میں نے پہچانا نہیں"

"آپ نہیں پہچان سکتیں دیدی۔ آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میرا نام شیاما ہے۔ مگر آپ مجھے شمّی کہہ کر پکاریں۔ میں عرصہ سے آپ کو اپنے من ہی من میں دیدی کہہ کے پُکارتی رہی ہوں۔"

"شمّی!"

"یہاں میں ایک ہسپتال میں ہُوں، ڈاکٹر سین کے ہسپتال میں کمرہ نمبر ۳۶۔ دیدی ایک بار آکر مِل جاؤ، آج میں بڑی مُشکل سے ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آئی ہُوں۔ سوچتی تھی کہ کسی اور کے بُلانے سے شاید آپ نہ تشریف لائیں۔ آپ ضرور آئیں دیدی...... نہیں کل نہیں دیدی۔ آج ہی آئیں۔ کیوں کہ زندگی کے پاس کئی دفعہ "کل" کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"اچھا مُلاقات کا وقت کیا ہے؟"

"ساڑھے چار سے ساڑھے سات تک"

"کمرہ نمبر چھتیس..... اچھا شمّی میں آؤں گی۔"

"ضرور آنا دیدی! میں آپ سے باتیں کرنے کے لئے کمرے میں تنہا ہی رہوں گی۔"

اور جب میں نے پانچ بجے شمّی کے کمرے میں قدم رکھا تو شمّی نے بستر سے اپنے دونوں بازو پھیلا کر کہا تھا۔ "دیدی"

خدا جانے شمّی کے لبوں پر کیا تھا کہ اُس نے محض ایک لفظ کہہ کر میرے ساتھ یہ ناطہ جوڑ لیا تھا۔

جب میں نے آپ کا 'ڈاکٹر دیلو' پڑھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں ہی ممتا ہوں اور آپ نے میری داستان تحریر کی ہو۔۔۔ پھر میں نے 'گھونسلہ' پڑھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں ہی نینا ہوں اور آپ نے ——"

شمی کا گلا رُندھ گیا

"تمہیں تکلیف کیا ہے شمی؟"

"زندگی نے مجھ سے مذاق کیا ہے دیدی! متواتر پانچ سال سے اس کے ستم کا بار اُٹھائے اُٹھائے پھر رہی ہوں۔۔۔۔ اور اب تھک گئی ہوں۔۔۔۔۔ اب اور ستم۔۔۔۔"

"شمی"

"جب میں نے محبت کے حروف پڑھنے شروع کئے تو زندگی نے میرے سامنے دو کتابیں رکھ دیں۔ ایک میں زندگی کا فلسفہ تھا، زندگی کا گیان تھا، زندگی کا حل تھا۔ دوسری میں دلچسپ کہانیاں تھیں۔ اور چند رنگین و شوخ تصویریں۔ پہلی کتاب مجھے مشکل نظر آئی اور میں نے زندگی کا وید الگ رکھ دیا۔ اور دوسری کتاب کی رنگین تصاویر میں محو ہو گئی۔ جب دل کے معنی سمجھنے شروع کئے تو مجھے میری کہانیاں تسکین نہ دے سکیں اور پھر جب میں نے پلٹ کر زندگی کے وید کو چھونا چاہا تو زندگی نے وید میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔۔۔"

"شمی"

"یہ کیسا المیہ ہے دیدی! پرتھی بھی ہمارے ہی کالج میں پڑھتا تھا۔ اور راجیش بھی! پرتھی کے پاس کھڑی ہو کر جب میں اُس کے سنجیدہ

اور گہرے چہرے کی طرف تاکتی تو مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا معلوم ہوتا۔ میں زندگی کے اِس فلسفہ کے سامنے بالکل انجان اور بے معنی سی دکھائی دیتی۔ لیکن جب میں راجیش کے پاس ہوتی تو اُس کے ساتھ رُوٹھ بھی سکتی تھی۔ اور مان بھی جاتی۔۔۔۔ مگر پرتھی کو دیکھ کر میرے دل میں اُس کے لئے تعظیم کے جو جذبات بھر جاتے اُن کا میں اس کے سامنے اظہار تک نہ کر پاتی۔ میری شادی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ میرے ماتا پتا نے مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ میں جسے چاہوں اس کا انتخاب کروں، اور میں نے راجیش کو چُن لیا۔"

"پھر"

"ابھی ہماری شادی میں ایک مہینہ باقی تھا کہ پرتھی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ایک دن کے لئے اُس کے ہمراہ پنجور کے مغل باغ چلوں۔ جہاں تک اُس پر اعتبار کا سوال ہے، مجھے اُس پر مکمل اعتماد تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ اُس کی پہلی اور آخری خواہش تھی۔ میرے پاس اُسے مایوس کرنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے ہاں کہہ دی۔۔۔۔"

"پھر شمی؟"

"پنجور دہلی سے کوئی ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ پرتھی کی اپنی کار تھی اور اُس کا اپنا ہمراز بوڑھا ڈرائیور اُسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہم کوئی پانچ گھنٹوں میں پنجور پہنچ گئے۔۔۔۔ راستے کی ایک بات بتاؤں دیدی؟"

"ہاں شمی!"

پنجور سے کوئی دس میل اس طرف کھجور کے درختوں کا جنگل

آتا ہے۔ یہاں کچھ دیر کے لئے ڈرائیور نے گاڑی روک لی کیونکہ انجن گرم ہوگیا تھا۔ تاحد نظر کھجور کے درخت ہی درخت دکھائی دیتے تھے، اُس جنگل نے مجھے مسحور کرنا شروع کر دیا. . . . سڑک کے بائیں طرف ایک کچا مکان تھا۔ جس کے آنگن میں ایک حسینہ تھی۔ جس کے سر پہ گوٹہ کناری لگی ایک اوڑھنی تھی۔ اور مٹی سے لپے ہوئے آنگن میں سُرخ مرچیں سُوکھنے کے لئے پھیلا رہی تھی۔ اپنی لانبی لانبی باہیں پھیلا کر جب وہ مرچیں بکھیرتی تھی تو اُس کا لال چوڑہ چھنکتا تھا۔ چوکھٹ کے پاس پڑی چارپائی پہ ایک نوجوان بیٹھا حقہ پی رہا تھا. . . کش لیتے ہوئے اُس نے دوشیزہ کو پکارا۔ اور وہ دست پناہ سے انگارے لائی۔ چلم پھر سُلگ اُٹھی۔ نا معلوم یہ کون سی چنگاری میرے دِل میں اُڑ کر آگئی تھی۔ یا اُس کے چوڑے کی جھنکار کا معجزہ تھا یا اس صحن میں سُوکھنے کے لئے ڈالی مرچوں کا غبار تھا یا کھجور کے درختوں کا جادو. . . . میں نے دیکھا کہ میں گوٹے کناری سے مرصع اوڑھنی سر پہ اوڑھے ہوئے ہوں، میری کلائیوں پر سُہاگ کا عروسی چوڑہ ہے اور میں سُرخ مرچیں آنگن میں پھیلا رہی ہوں۔ سامنے کھاٹ پہ پرتھی بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ پرتھی نے مجھ سے آگ مانگی ہے. . . . ."

"پھر؟"

"ڈرائیور نے کار سٹارٹ کی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ دس میل کا فاصلہ منٹوں میں طے ہوگیا۔ پرتھی نے پہلے سے ہی دو کمروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ سامان کمرے میں رکھ کر ایک کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ کمرے کی ایک کھڑکی بائیں باغ کے پہلو میں کھلتی تھی۔ ایک منزل سب سے بلند تھی۔

دوسری اُس سے کم، تیسری اس سے نیچے۔ باغ کی سات منزلیں تھیں۔ ان ساتوں منزلوں پر سرو کے پودے، آم اور لیچیوں کے درخت تھے۔ گلِ گلاب اور چاندنی جیسے رنگا رنگ کے پھول چمک رہے تھے۔ مجھے ان کے سحر سے ڈر لگنے لگا۔"

"ڈرائیور نے سٹوو جلا کر چائے تیار کی، اور ایک ایک پیالی پی کر میں اور پرتھی "کوشلیا ندی" کا نظارہ کرنے چلے گئے۔ ندی کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ پگڈنڈی سے نیچے اُتر کر جب ہم ندی کنارے پہنچے تو پانی کے لمس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے بلایا۔ میں نے پرتھی سے کہا "میں تو ندی میں نہاؤں گی۔" فلک بوس پہاڑیوں کی سہ طرفہ دیواریں بلند تھیں۔ جن میں گھری ہوئی کوشلیا ندی بہہ رہی تھی۔ سامنے ہری ہری سیڑھیوں کی صورت پھیلے ہوئے کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ کچھ فاصلے پر آموں کا ایک جھنڈ تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک بوڑھی پہاڑن بکریاں چرا رہی تھی۔ ندی ریتلی اور پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ سمٹ سمٹ کر چل رہی تھی۔ اِس لئے چند قدموں کے فاصلے بھی اوٹ دے دیتے تھے۔ پرتھی دُوسری طرف چلا گیا اور میں لاپرواہی سے ندی میں نہانے میں محو ہوگئی۔ جب میں نہا رہی تھی دیدی تو. . . . ."

"ہاں شمی!"

"میری کلائیوں پر کانچ کی سُرخ چوڑیاں تھیں۔ پانی میں ڈوبی ہوئی اپنی باہیں مجھے پہلی بار بھلی معلوم ہوئیں۔ چوڑیوں کا سُرخ رنگ مجھے شگنوں کا رنگ محسوس ہوا۔ یہ شاید پہلا موقعہ تھا دیدی جب

میرے اندر کہانیوں کی کتاب کو ایک طرف رکھ کر زندگی کا وید پڑھنے کی خواہش نے سر اُٹھایا"

"شاید دُوسری بار شمی! . . . . پہلی بار اُس وقت جب تم کھجوروں کے جنگل میں . . . . سر پر گوٹے کناری کی اوڑھنی لئے تم کچے آنگن میں سُرخ مرچیں پھیلا رہی تھیں اور پرتھی کھاٹ پر بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا . . . ."

"ہاں دیدی۔ پہلی بار وہی تھی۔ اور یہ دُوسری ——"

"پھر؟"

"سائے ڈھل چُکے تھے۔ میں ندی سے باہر آگئی۔ اپنا بدن سُکھایا کپڑے پہن کر پرتھی کو ڈھونڈنے لگی۔ ریت کے پتھریلے کنارے پر بیٹھے ہوئے میں نے اُسے پایا۔ وہ نہا چُکا تھا لیکن ابھی تک اُس نے پُوری طرح کپڑے نہیں پہنے تھے۔ وہ ایک بڑی چٹان پر خاموش بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں اُس کی پیٹھ کو تاباں کر رہی تھیں۔ یہ تابانی میری آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی . . . . اور میں نے آنکھیں جُھکا لیں مجھے دیکھ کر اُس نے کپڑے پہن لئے۔ پھر ہم پہاڑ پر جانے والی پگڈنڈی پر ہو لئے۔ راستہ میں بکریاں چرانے والی پہاڑن نے اُسے آواز دے کر پُوچھا کہ میں نے دیوی کے استھان پر کیا چڑھایا تھا، اور کیا مُراد مانگی تھی؟ لیکن میں تو ندی کے پانی کی روانی میں ہی گُم ہو گئی تھی۔ اور نزدیک کسی بھی استھان کو تو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی مُراد مانگی تھی۔ میں ہنس کر چل دی . . . . دیدی، جو سچ پُوچھو تو میں پڑھی لکھی تھی، کبھی کسی وہم کا شکار نہیں ہوئی تھی نہ جانے اس وقت مجھے کیوں ہوا کہ جیسے میں کسی مُراد سے فیض یاب نہیں ہو سکی۔"

"پھر شمی؟"

"ڈرائیور نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ تھوڑا سا کھایا۔ اور پھر میں اور پرتھی باغ میں بیٹھ کر پہاڑیوں کی اوٹ سے طلوع ہوتے چاند کا نظارہ کرنے لگے۔ درختوں کے سنولائے چہرے نور میں دھوئے گئے۔ میں منتظر تھی کہ شاید پرتھی مجھ سے کچھ کہے . . . . مگر وہ خاموش رہا . . . . ایک جگہ پانی کی تیز و تند آبشار تھی اور پھوارے تھے۔ میں اور پرتھی اُن کے پاس کھڑے ہو کر ننھی مُنّی پھوار سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ سردی کی ایک ہلکی سی کپکپی میرے تمام جسم میں سرایت کر گئی۔ پرتھی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میرا دایاں کندھا اس کے سینہ سے چھُو گیا تو ایک خوش گوار گرمی کندھے میں سرائیت کرنے لگی۔ سامنے پتھر کی دیوار میں دیئے جلانے کے لئے چھوٹے چھوٹے طاق بنے ہوئے تھے۔ کہہ نہیں سکتی کتنے ہوں گے۔ سو سے کم تو کیا ہوں گے۔ مجھے محسوس ہوا کہ پرتھی کے جسم کی گرمی میرے کندھے میں تحلیل ہوتی ہوئی اب میرے اپنے دِل کی آنچ بن گئی ہے۔ اور اس آنچ سے سامنے کے دیوٹوں میں رکھے دیے خود بخود جل اُٹھے ہیں . . . .

دیدی . . . . . دیدی"

"ہاں شمی!"

"میرے جی میں آئی کہ جو آگ مجھے جلائے جا رہی ہے۔ اُس کی بات میں نہ کہوں، پرتھی کہے۔ مگر پرتھی نے کچھ نہیں کہا۔ اُس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح کسی بھی اثر سے بے نیاز تھا . . . . . میں اپنی آگ سمیٹنے لگی . . . . کافی رات گئے ہم باغ سے لوٹے . . . . اور اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔

دیدی! اُس رات میرے سپنوں نے کئی چراغ روشن کئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ باغ میرا ہے۔ میں ایک مُغل شہزادی ہُوں، جو رات کو تن تنہا گھوم رہی تھی۔ سَرو کے پودوں کو میں نے اپنے ہاتھوں سے چھُوا۔ سُرخ گلاب کو توڑ کر میں نے اپنے بالوں میں سجایا۔ پھر پانی کے چشموں کے پاس کھڑی ہو کر میں خالی طاقوں پر دیے جلا جلا کر رکھنے لگی۔ ایک دیے کی لَو دُوسرے دیے سے چھُوتی گئی اور پھر آبشار کی اوٹ میں پتھر کے طاقوں میں کوئی سو ایک دیے جَل اُٹھے کہ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پانی کی پھوار سے کپکپاتے جسم میں ایک دِل نواز گرمی کی لہر دوڑ گئی، اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو پرتھی ایک مغل شہزادہ بنا کھڑا تھا۔ جس کے لبوں کی سانس میرے لبوں سے گزر رہی تھی۔

میں اس سپنے کی تاب نہ لا سکی اور وہ ٹوٹ گیا۔ میرے قدم حرکت میں آ گئے۔ میں پرتھی کے کمرے کی طرف بڑھی، تاکہ میں اس پر اپنا یہ سپنا ظاہر کر دُوں اور پھر اس سے کہوں کہ اگر وہ اس سپنے کو حقیقت میں بدل دے تو مجھے دُنیا میں اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

"پھر شمی؟"

"میری تقدیر نے میرے قدموں کو تھام لیا۔ میرے دل نے جو دُنیا اپنائی تھی، وہ اپنالی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھ سے اب کوئی پرتھی کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا اب میں انجان نہیں تھی۔ اب مجھے زندگی کے وید کو پڑھنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔"

"پھر شمی؟"

"دیدی جب میں صبح بیدار ہوئی۔ تو زندگی نے میرے ساتھ اپنا

فریب مکمل کر لیا تھا۔ پرتھی مجھے کہیں نہ مِلا۔ میں نے اُس کا کمرہ، برآمدہ، غُسل خانہ اور باغ کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ

"صاحب آدھی رات کو ہی چل دِئے تھے۔ اور میں اُنھیں کالکا تک چھوڑ آیا ہُوں۔ وہاں اُنھوں نے ٹیکسی لی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اب آپ جب کہیں دہلی لے چلوں گا۔ گاڑی باہر کھڑی ہے۔" اِرد گرد کی تمام دیواروں کے پتھر میرے پاؤں سے بندھ گئے۔ کتنی دیر بعد میں جب بستر باندھنے لگی تو دیکھا کہ تکیئے کے نیچے پرتھی کا لکھا ایک خَط تھا۔ خط نہیں محض دو سَطریں:

چُکتا نہ کر سکوں گا اپنا حِساب تجھ سے
یہ رات چاندنی جو میں نے اُدھار لی ہے"

"شمی! کیسا ہوگا تیرا پرتھی؟ ایسی گمبھیرتا اور سنجیدگی تو اِنسانوں میں نہیں دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے۔"

"اِسی سنجیدگی نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا دیدی!"

"پھر شمی؟"

"میں دہلی لوٹ آئی۔ مگر مجھے پرتھی کا کہیں کوئی سراغ نہ مِلا۔ نہ اُس کے گھر والوں کو کوئی پتہ چلا نہ مجھے۔ ۔ ۔ ۔ ایک برس بیت گیا۔ سَب نے سوچ لیا کہ وہ زِندہ نہیں ہے۔ زندگی کا فریب میں نے اپنے دامن میں لیکر راجیش سے شادی کر لی۔"

اب ایک برس ہُوا میں نے پرتھی کی تصویر اخباروں میں دیکھی۔ لندن میں اس کی نظموں کا ترجمہ چھپا ہے۔ اس کا نام اب دُنیا کے

مشہور شاعروں میں گِنا جاتا ہے۔ مگر وہ رات جو اُس نے مجھ سے مستعار لی تھی، اور کہا تھا کہ اس کا حِساب اُس سے کبھی بھی چُکایا نہ جا سکے گا، اب وہی حِساب مجھے چُکانا پڑ گیا ہے۔ میں زندگی کے ساتھ اس کا حساب چُکا نہیں سکتی تھی۔ میں موت کے ساتھ اب وہ حِساب چُکتا کروں گی دیدی۔"

"نہیں شمّی! زندگی کے ساتھ حِساب چُکانا ہی بہادری ہے۔ یہ حِساب موت سے نہیں چُکایا کرتے۔ زندگی موت سے کہیں مُشکل ہے شمّی"

مگر اب میں تھک گئی ہُوں دیدی۔ دونوں پھیپھڑے ناکارہ ہو چُکے ہیں —— کِن ہونٹوں سے اُس کو پُکاروں؟ کِن آنکھوں سے اُس کی راہ دیکھوں؟

آج رات پانچ سال پہلے کا سپنا پھر آیا۔ وہی باغ ہے، وہی آبشار ہے۔ میں اسی طرح مُغل شہزادی ہوں۔ پتھر کے طاقوں پر میں نے دِیئے روشن کیے ہیں۔ مگر پرتھی کہیں نہیں مِلتا۔ پھر طوفان اُٹھا۔ سنسناتی سیٹیاں بجاتا ہوا طوفان اور میرے تمام چراغ گُل ہو گئے۔ گھور اندھیرا چھا گیا۔ بہت گھور بہت گہرا . . . . .

اِسی لئے آج مجھ سے برداشت نہ ہو سکا دیدی۔ پرتھی کو میرا سپنا بتانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ جب میں اُسے بتانے چلی تھی تو وہ اُسے سُننے سے پہلے ہی چلا گیا۔ اور آج میں ہی وہ سپنا دیکھتی دیکھتی جانے والی ہُوں۔"

"نہ شمّی یوں نہیں کہتے!" میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"دیدی! آپ میری دیدی بن جائیے، بڑی دیدی ——"

"شمّی! میرے لئے بولنا محال ہو گیا تھا۔

"سب مجھے شیاما کہہ کر پُکارتے ہیں۔ ایک پرتھی مجھے شمّی کہتا تھا اور ایک میرا دل چاہتا ہے کہ آپ پُکاریں۔ ایک اپنے پرتھی کے سوائے اور ایک اپنی دیدی کے سوائے میں کسی کی شمّی نہیں ہو سکتی۔"

"شمّی!"

"دیدی، آپ نے کسی ممتا کا افسانہ لکھا تھا۔ کسی نینا کی داستان تھی۔ اب اِس نامراد شمّی کی کہانی بھی لکھ دینا۔ شمّی کا وہ سپنا بھی لکھ دینا جِس کو پرتھی نے کبھی نہ سُنا اور اس کو کہنا کہ شمّی کی زندگی میں چاندنی رات محض ایک ہی بار آئی تھی . . . ."

میں کل سات بجے شمّی کی بیمار پیشانی پہ بوسہ دے کر آئی تھی۔ یہی سہ پہر کا وقت تھا جب اُس نے مجھے دیدی کہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پہ نہ جانے کون سا سحر تھا کہ ایک لفظ کی ڈوری سے اُس نے میرے ساتھ اس رشتے کی گانٹھ پکّی کی تھی۔ ابھی پُورے چوبیس گھنٹے بھی نہ ہونے پائے کہ وہ زندگی کے سارے رِشتے ناطے توڑ کر چلی گئی۔ ہسپتال میں سے میرے فون کا جواب آیا ہے —— "شمّی؟ کون شیاما؟ اچھا تو آپ کی مُراد مِسز راجیش سے ہے . . . . مِسز راجیش کا تو انتقال ہو گیا ہے . . . یہی کوئی ایک گھنٹہ ہوا . . . ."

شمّی نے سب سے اپنے رشتے توڑ لئے ہیں۔ مگر جن دِلوں میں اُس نے محبت کے رِشتے استوار کئے ہیں۔ انہیں موت بھی نہیں توڑ

سکے گی۔ دنیا والوں کی شیلا مر گئی ہے۔ لوگوں کی مسز راجیش گزر گئی ہے۔ مگر میں نہیں مان سکتی کہ میری شمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ شمی اپنی دیدی کی کہانیوں میں زندہ رہے گی۔ شمی اپنے پرتھی کے گیتوں میں زندہ رہے گی۔

نیل کمل

چیت کا مہینہ تھا۔ رات تاروں سے بھری ہوئی تھی۔ نیند میری آنکھوں میں آتی ہی نہ تھی۔ میں نے سرہانے پڑے ہوئے لیمپ کو روشن کیا اور اُس کی روشنی میں پڑھنے لگی۔

”موسیقی! تونے میری غمگین رُوح کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ موسیقی تُونے مجھے قوت، سکون اور مسرت دی ہے، میرے پیار! میری دولت میں تیرے پاکیزہ لبوں کو چُومتا ہوں، تیری شیریں زلفوں میں اپنا مونہہ چھپا لیتا ہوں۔ میں اپنی آنکھوں کی تپتی ہوئی پلکیں تمہاری ٹھنڈی ہتھیلیوں پر رکھ دیتا ہوں —— ہم مونہہ سے کچھ نہیں کہتے، ہماری آنکھیں بند ہیں —— لیکن میں تمہاری آنکھوں کا ناقابل بیان نور دیکھ سکتا ہوں —— اور میں تمہارے خاموش لبوں کی مسکراہٹ پیتا ہوں —— اور میں تمہارے سینے سے لگ کر لافانی زندگی کی دھڑکن

سُنتا ہُوں"

جین کرسٹاف کے یہ بول پیانو کے سُروں کو چُومتے رہے۔ اور میں نے لیمپ گُل کر کے ایک بار پھر تاروں کی روشنی کو آنکھوں میں بھر لیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

کسی کے سانس مجھے گردن کے قریب محسوس ہوئے۔ میں چونک کر جاگ پڑی۔ میرے سرہانے ایک پری صُورت عورت کھڑی تھی۔ اس کے لباس میں سر سے پاؤں تک تارے جڑے ہُوئے تھے۔

میری آنکھیں اس کے حُسن کی تاب نہ لا سکیں۔ نور کی اس ندی میں جیسے خوشبوؤں کی ایک لہر آئی، مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میں لہروں میں سما گئی ہُوں۔ ایک بار پھر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے بالوں کی ایک ایک تار میں پھُول گندھے ہُوئے تھے۔

"تو ایک بار میرے ساتھ آئے گی؟" موتیوں کی جھنکار جیسی اُس کی آواز آئی۔ اس نے اس انداز سے بات کہی کہ دُنیا کا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا، اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کئی راہیں ہمارے پاؤں کو چھُوتی رہیں

پھُولوں کی پتیوں کو جوڑ جوڑ کر جیسے کسی نے ایک محل بنوایا ہو، لوگوں کے راستوں کو بھی پھُولوں سے سجاؤں گی۔

اُس دِن اُس نے سَب راستوں پر پھُول بچھائے ہوئے تھے۔ اُس دِن زِندگی اپنے محبوب سے ملنے کے لئے جا رہی تھی۔ اُس کے پاؤں کو پھُول بہت اچھے محسوس ہوئے اور اُس نے کئی پھُول اپنے جوڑے

میں لگا لئے اور کئی پھُول پرو کر اُس نے اپنے بازوؤں پر لپیٹ لئے اور میری ماں کو دُعا دی کہ اُس کے ہاں ایک ایسی لڑکی پیدا ہوگی جو دُنیا کی سَب سے زیادہ خوبصورت عورت ہوگی۔

"میں اُس کا نام کیا رکھوں؟" میری ماں نے پُوچھا

"اس کا نام محبت رکھ دینا" زندگی نے کہا اور پھُولوں سے بھرے ہُوئے راستوں کو طے کرتی ہوئی اپنے محبوب سے ملنے کے لئے چلی گئی۔

جَب میں پیدا ہُوئی تو میری ماں نے زندگی کے کہنے کے مطابق میرا نام محبّت رکھ دیا"

زندگی نے دھرتی کو کتنی اچھی دُعا دی، میں نے ایک بار پھر اُس دیوی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"پھر ایک دِن میری ماں نے باغوں کے سَب ہی پھُول لے کر اپنے گھر کو سجا دیا، اُس دِن لوگوں کے سَب ہی راستے ویران تھے، ماں نے پھُولوں کے کانٹے الگ کر کے پھینک دِئے اور پھُولوں کی پتیوں سے میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو سچ مچ پھُولوں کی پتیاں ہی تھیں۔ لیکن نہ جانے وہ کس سَہارے پر تھیں، پھُولوں کی دیواریں اور پھُولوں کی چھتیں، اور پھُولوں ہی کے فرش تھے پھُولوں کی سیج پر بیٹھے ہُوئے اُس نے کہا "آج میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی جب میرے دِل میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے اُس وقت میں اسی طرح کسی کو اپنے پاس بٹھاتی ہوں اور پھر جب میں اپنی پُوری کہانی سُناتی ہوں تو مجھے کچھ سکون سا مِل جاتا ہے۔"

پھُولوں کے گھر میں رہنے والی اور ستاروں کا لباس پہننے والی

عورت کو بھی غم ہو سکتا ہے، میں کچھ سمجھ نہ سکی ۔

"تمہیں کتابیں پسند ہیں نا ـــــ" اُس نے کہا۔

" میرے پاس صرف یہی تو دولت ہے' اور کوئی بھی دولت مجھے اس سے زیادہ عزیز نہیں ہے "

"اِسی لئے میں تمہیں اپنی کہانی سُناؤں گی' ان اچھی کتابوں میں بھی میری ہی باتیں ہوتی ہیں، لیکن آج میں اپنے موہنہ سے تمہیں اپنی کہانی سُناؤں گی ۔

میری ماں کا نام دھرتی ہے۔ میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی، ایک دِن اُس نے سوچا، میں اپنا گھر تو روز پھولوں سے سجاتی ہوں' آج میں اپنا سنگھار کرنے لگی، اُس دِن بھی زِندگی اپنے محبوب سے مِلنے کے لئے جا رہی تھی۔ جب وہ ہمارے گھر کے سامنے سے گزری تو ماں کے پھینکے ہوئے کانٹے اُس کے پاؤں میں بُری طرح چُبھ گئے ۔

زِندگی کے پاؤں لہولہان ہو گئے اور اُس نے میری ماں کو بد دُعا دی کہ اس کے ہاں ایک ایسی لڑکی پیدا ہو گی جو دُنیا کی سب سے زیادہ بدصورت عورت ہو گی۔ اُس کا نام نفرت ہو گا ۔

میری ماں رونے لگی۔ لیکن غصے میں بھری ہوئی زِندگی نے اپنی بد دُعا واپس نہ لی۔ جب میری ماں کے ہاں دوسری لڑکی پیدا ہوئی تو وہ واقعی بدصورت تھی اور اُس کے سب اعضا میں زہر بھرا ہوا تھا۔

"وہ اس وقت بھی زِندہ ہے؟" میں نے سہمے ہوئے پوچھا

" ہاں! وہ زِندہ ہے' وہ جسے بھی چھوتی ہے اس کے جسم میں زہر بھر جاتا ہے "

"زہر"

" میں تمہیں وہ لوگ دکھاؤں جنہیں اس نے ڈنک مارے ہیں" میں ڈر گئی، گھبرا گئی اور اس دیوی کے آنچل کو تھام لیا ۔

" ڈرو مت۔ میں دُور ہی سے تمہیں دِکھاؤں گی " اور اُس نے پھولوں کی ایک کھڑکی کھولی ۔

پھولوں کے محل سے کوئی سو گز دُور سامنے آگ جل رہی تھی ـــــ اردگرد لوگوں کا جھرمٹ تھا۔ مرد بھی تھے' عورتیں بھی ـــــ جب آگ کی لپٹیں ایک بار بلند ہوئیں تو میں نے غور سے دیکھا کہ جسم کی بناوٹ سے جو لوگ مرد اور عورتیں ـــــ ظاہر ہوتے تھے اُن کے موہنہ سانپوں کے موہنہ کی مانند تھے ہاتھ، پاؤں، ٹانگیں، باہنیں سب آدمیوں جیسی تھیں۔ لیکن اُن کے سانپوں کے موہنہ کی مانند موہنہ سے لال لال زبانیں نکل کر آگ کو چاٹ رہی تھیں۔ اُنہوں نے ہاتھوں میں جو پیالے سے لئے ہوئے تھے، آگ کی روشنی میں میں نے دیکھا وہ آدمیوں کی کھوپڑیاں تھیں ۔

میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور پھر شاید مجھے ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھُلی تو میں اُس دیوی کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور پھولوں کی کھڑکی بند تھی۔

" بہت ڈر لگا تھا ؟" دیوی نے پُوچھا۔

مجھے ایک بار پھر وہ آگ اور اس کے اردگرد کھڑے ہوئے وہ لوگ یاد آ گئے جن کے سر سانپوں کے سروں کی مانند تھے اور دھڑ آدمیوں جیسے ـــــ میں پھر کانپ اُٹھی ۔

"دِن کے اُجالے میں تو انہیں کئی بار دیکھتی ہے، تو تجھے ڈر نہیں لگتا"

"میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"دِن کے اُجالے میں لوگ چہرے پر نقاب ڈال لیتے ہیں۔"

"نقاب"

"آدمیوں کے مونہہ جیسے اُنھوں نے نقاب بنا رکھے ہیں، اپنے سانپ نما سروں کو ڈھانپنے کے لئے یہ ہمیشہ نقاب پہنے رہتے ہیں۔"

"تو ان میں ہر وقت زہر بھرا رہتا ہے۔" میرا جسم جیسے برف کا ٹکڑا ہو گیا ہو۔

"یہ سَب ہی بچارے میری بہن کے ڈسے ہوئے ہیں۔ ان کی رگ رگ میں زہر بھرا ہوا ہے۔ ان میں سے کئی اِس دُنیا کے مشہور و معرّوف لوگ ہیں۔"

"دیوی! یہ کیا کام کرتے ہیں؟"

"یہ صرف ڈاکے ڈالتے ہیں، لاکھوں لوگوں کی محنت کا پھل لُوٹ لیتے ہیں۔"

"اُن کے پاس بڑے ہتھیار ہوں گے۔"

"اپنے ہتھیاروں سے یہ بناتے کچھ نہیں۔ یہ صرف چھین لینا اور مارنا ہی جانتے ہیں۔"

"لیکن دیوی! اگر تمہاری بہن کبھی تمہیں ڈس لے؟"

"وہ مجھے ڈس نہیں سکتی۔ وہ مجھے ہر طرح دُکھ پہنچا سکتی ہے۔"

"شُکر ہے کہ وہ تمہیں ڈس نہیں سکتی۔"

"میرے لباس میں جڑے ہوئے تاروں سے جو روشنی نکلتی ہے اُس سے اُس کی آنکھوں میں دھندلکا چھا جاتا ہے اور وہ میرے پاس نہیں آ سکتی۔ پھر میرے پسینے سے جو خوشبو آتی ہے اس سے وہ گھبرا جاتی ہے۔ اور مجھ سے دُور ہٹ جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ مجھے کب کی ڈس چکی ہوتی۔ جو حسد اُسے مجھ سے ہے، وہ شاید دُنیا کی کسی اور شے سے نہیں۔ اگرچہ وہ مجھے ڈس نہیں سکتی لیکن اُس نے مجھے ہر طرح دُکھی بنا دیا ہے۔"

"میری دیوی!"

"صَدیاں گزر گئیں، کئی صَدیاں —— میں اپنے محبوب سے مِل نہیں سکتی۔" دیوی کے چہرے پر رقت کے اثرات اُبھر آئے۔ "میرے محل کو آنے والے سَب ہی راستوں پر اس زہریلی لڑکی نے زہر بکھیر رکھا ہے۔"

اب مجھے دیوی کے دُکھ کا پتہ لگا۔

"کئی بار میرا محبُوب میرے پاس سے نکل جاتا ہے جب وہ آتا ہے تو زہریلی لڑکی اپنا آنچل میرے چہرے کے آگے پھیلا دیتی ہے اور وہ مجھے پہچان نہیں سکتا —— صَدیاں گزر گئیں، کئی صَدیاں۔ اگر مجھے ہمیشہ جوان رہنے کی دُعا نہ ملی ہوتی تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ تُو نے اپنی دُنیا میں نہیں دیکھا کہ محبّت کرنے والے کبھی منزل کو نہیں پا سکتے۔ میں جس سے پیار کرتی ہُوں جَب تک وہ مجھے نہیں مِلے گا، دُنیا میں محبّت کرنے والوں کو ان کی منزل نہیں ملے گی۔" دیوی نے پھُولوں کے تکئے کا سَہارا لیا، شاید اس کا دُکھ بہت بڑھ گیا ہے۔

"میری دیوی! ـــــ" میرے آنسوؤں سے میرا چہرہ بھیگ گیا "کیا صدیاں یوں ہی گزر جائیں گی؟"

"صرف ایک تدبیر ہے۔"

"کوئی تدبیر بتاؤ دیوی! تمہاری پوجا کرنے والے بھی بے شمار ہیں کوئی تدبیر بتاؤ۔ نہیں تو کسی دن وہ بھی ڈسے جائیں گے۔"

"جب کوئی میرے گیت گاتا ہے، جہاں تک اُن گیتوں کی آواز جاتی ہے وہاں تک میری بہن کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔"

"تمہارے گیت! میری دیوی! تمہاری پوجا کرنے والے تمہارے گیتوں کو دُنیا کے ہر کونے میں بکھیر دیں گے۔"

"کئی بار بہت اچھے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ میرے گیت لکھتے ہیں۔ اور جب لوگ ان گیتوں کو پڑھتے ہیں، لوگوں کے راستوں میں پھولوں کے رقص ہوتے ہیں۔ لیکن جب لوگ زہریلی لڑکی کے پیالے سے زہر کی بوندیں پی لیتے ہیں تو وہ میرے گیت گانے بند کر دیتے ہیں اور جب لوگ میرے گیتوں کو بھول جاتے ہیں تو اس وقت میری بہن موت کا ناچ ناچتی ہے۔ میری بہن اِنسانوں کی کھوپڑیوں میں زہر بھر بھر کر لوگوں کو پلاتی ہے، تو نشے میں مست وہ لوگ آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر ہنستے ہیں اور موت کا ناچ ناچتے ہیں۔"

"میں لوگوں کے لبوں پر تمہارے گیت بکھیر دوں گی، بہت اچھے لوگوں نے تمہارے بہت اچھے گیت لکھے ہوں گے، میری دیوی! اگر مجھ سے اتنے اچھے گیت نہ بھی لکھے جا سکے، پھر بھی میں تمہارے گیت لکھوں گی۔"

"میرے گیت دِل کے خون سے لکھنے پڑتے ہیں، میری پیاری!"

میں نے دیوی کے چہرے کی طرف دیکھا تو میری آنکھوں نے کہا۔ "تمہاری بات مجھے کسی بھی قیمت پر منظور ہے۔"

دیوی کے اِس پھولوں والے محل میں ایک تالاب کنول کے پھولوں سے بھرا ہُوا تھا۔ اس کے کنارے کھڑی ہو کر ایک کھلے ہوئے نیل کمل کی طرف اُنگلی اُٹھا کر اُس نے کہا۔ "اس میں دیکھو۔"

میں نے اس کا حکم سر آنکھوں پر لیا اور نیل کمل کے کھلے ہوئے دِل میں دیکھا۔

"کچھ دِکھائی دیا؟"

"ہاں دیوی! ایسا ایک چہرہ جو ساری عُمر بھلایا نہ جا سکے۔"

"تو ساری عمر نہیں بھول سکے گی پیاری! ساری عمر نہیں بھول سکیگی۔"

"اس کنول میں جو بھی جھانک کر دیکھتا ہے، کیا اسے یہی چہرہ دِکھائی دیتا ہے؟"

"نہیں پیاری! جس طرح پانی میں دیکھنے والے کو صرف اپنا مونہہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اِسی طرح اس پھول میں ہر ایک کو اپنی منزل دِکھائی دیتی ہے اور ہر ایک کی منزل اپنی اپنی ہوتی ہے۔"

"اس پھول کو صرف نیل کمل ہی کہتے ہیں۔"

"نہیں، اِس پھول کو تصوّر یا خیال بھی کہتے ہیں۔"

"یہ چہرا ـــــ میری منزل" حیرت کے سائے میں خوف کی پرچھائیں شامل ہو گئی اور میں دونوں میں گھِر گئی۔

"تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے اس کا انتظار بس جائے گا۔ اور اس کی یاد تمہارے دِل میں جب بھی تڑپ پیدا کرے گی، تمہارے دِل سے لہو

بہہ نکلے گا۔ میرے گیت اسی لہُو کے پاکیزہ رنگ سے لکھے جاتے ہیں، میری پیاری!"

"میں اس چہرے کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔" یہ پہلی سچّی تڑپ تھی جس سے کانپ اُٹھی۔

"نہیں پیاری! کبھی نہیں، نہ تُو نہ کوئی اور اپنی منزل کا مونہہ دیکھ سکتا ہے، ہمارے راستوں میں بددُعائیں بچھی ہُوئی ہیں۔ تو میری طرف نہیں دیکھتی۔ صدیاں گزر گئی ہیں۔"

میری آنکھوں میں سینکڑوں آنسو اُمڈ آئے۔ اور میں نے اس تاروں جڑے آنچل کو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا، پھر شاید مجھے ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھُلی تو نہ وہ پھُولوں کا محل تھا نہ وہ دیوی ہی تھی۔ اپنی چارپائی کو میں نے ٹٹولا۔ میرے سرہانے وہی لیمپ اور وہی کتاب پڑی تھی۔ کئی برس گزر گئے ہیں، مجھے ابھی تک پتہ نہیں لگا کہ اُس رات میں نے خواب دیکھا تھا یا اُس رات پریوں کی کہانی جیسی یہ کہانی واقعی پیش آئی تھی۔

نیل کمل میں دیکھا ہُوا مُکھڑا مجھے اسی طرح یاد ہے، میری آنکھیں بھر بھر آتی ہیں تڑپ برداشت نہیں کی جاتی اور میں اپنے قلم کو اپنے دِل کے پاکیزہ خون سے تر کر کے محبّت کے گیت لکھنے بیٹھ جاتی ہُوں۔

دُھواں اور شعلہ

ہردیو نے جب تہ بند اُتار کر پتلون پہنی اور گلے میں نکٹائی لپیٹ کر اُسے گانٹھ دینے لگا تو اُسے یہ محسوس ہوا جیسے سات دن پہلے کا ہردیو کوئی اور ہی تھا اور آج کا ہردیو وہ ہردیو نہیں۔ سات دِن پہلے کے ہردیو کو اُس نے گھبرا کر آواز دی "دیو"۔ دیو کے نام سے اُس نے اِس لئے پُکارا تھا کیونکہ ہفتہ بھر برہی اُس کو دیو کہہ کر ہی پُکارتی رہی تھی۔ پُورا نام لینا اُس کے لئے مُشکل تھا۔

"ہاں ہردیو۔" دیو کی آواز آئی۔

"مجھ سے یوں جُدا ہو جاؤ گے دوست!"

"شاید ہونا ہی پڑے ہردیو! یوں بھی تو ہم ایک ہی دُنیا کے رہنے والے نہیں معلوم ہوتے۔"

"کیوں میں کوئی ایسا غیر ہُوں؟"

"غیر؟ ہاں غیر ہی تو کہہ سکتا ہوں۔ مجھ سے تو اب تم پہچانے بھی نہیں جاتے۔"

"لباس کی تبدیلی اتنا فرق ڈال سکتی ہے؟"

"نہیں ہردیو! محض لباس کی بات نہیں۔ تم ایک مصنف ہو اور مصنف بھی ایسے، جس کا نام ہزاروں انسانوں کی زبان پر ہے۔ اور میرا نام . . . . میرا نام تو شاید برہمی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

ہردیو کو اس بات کا دھکا سا لگا۔ اُس کے جی میں آیا کہ کہہ دے "دیو . . . . دیو! میرے دوست! تم مجھ سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہو، ہزاروں لوگ میرا نام لیتے ہیں۔ مگر مجھے کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی مجھے جانتا ہے۔ تمہارا نام کوئی نہیں جانتا، صرف ایک ہفتہ تک برہمی نے ہی تمہیں تمہارے نام سے پکارا اور تمہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ برہمی تمہیں جانتی ہے۔"

مگر ہردیو نے کچھ نہیں کہا۔

"ہردیو! ایسی بھی کیا مایوسی! ہر جگہ تمہارے لئے پلکیں بچھائی جاتی ہیں، ہر کالج میں تمہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کل دھرمشالہ گورنمنٹ کالج کی طرف سے تمہارا استقبال ہونے والا ہے۔ کتنے لڑکے اور لڑکیاں تمہارے گرد منڈلائیں گی، کتنے دلوں میں تم سے دو باتیں کرنے کی تمنا ہوگی، کتنے لوگ آٹوگراف لینے کے لئے تمہارے گرد جمع ہو جائیں گے، کتنی ہی حسینائیں جب اپنے محبوبوں کو خط لکھیں گی تو تمہارے گیتوں کی زبان میں اپنے دل کی باتیں کہیں

گی۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ ایک مرتبہ جب تم اپنی سیٹ بُک کرانے کے لئے کھڑکی پر پہنچے تو تمہارا نام سُن کر بکنگ کلرک کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے لوگوں نے جب ڈبے کے باہر تمہارا نام دیکھا تو تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے تمہارے ڈبے کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔"

"کچھ نہ کہو دیو! یہ سب ٹھیک سہی، مگر اس سے دِل کی خلاؤں کو تو نہیں بھرا جا سکتا۔"

"پھر؟"

"تم بھی میرے ساتھ چلو، جہاں میں رہوں، وہیں میرے ساتھ رہنا۔ مجھے اپنی مصروفیات سے جب بھی فرصت ملے گی، تم سے باتیں ہوا کریں گی۔ میں تنہا ہوں، بالکل تنہا ـــــ ہزاروں اِنسانوں کے ہجوم میں تنہا۔ میں تمہارے سامنے اپنا دِل کھول کر رکھ سکوں گا۔"

"مجھے تمہارا شہر، تمہاری تہذیب اور تمہارا تمدن برداشت نہیں کر سکے گا۔ ہردیو! تم کبھی ہندوستانی شاعری کی باتیں کرتے ہو۔ کبھی انگریزی شاعری اور کبھی روسی شاعری کی باریکیاں بیان کرتے ہو، تم انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہو، کبھی رومانی شاعری کہتے ہو کبھی حقیقت پسندانہ یا اشاراتی اور کبھی ترقی پسند اور کبھی روائتی۔ مجھے اِن باتوں کا کچھ پتہ نہیں۔"

ہردیو نے سر جھکا لیا۔ بیتے دِن اُسے یاد آ گئے۔ برسوں سے اس کے اندر ایک آگ سی سُلگ رہی تھی، ایک دُھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ مگر

پچھلے کچھ مہینوں سے اُس کا دَم گھُٹنے لگا تھا۔ دھرمشالہ کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے اُسے دعوت دی تھی کہ وہ اُن کے کالج میں تین لیکچر دے۔ ایک 'قدیم شاعری' پر، دُوسرا 'جدید ہندوستانی شاعری' پر اور تیسرا ہندوستانی شاعری کا دُوسرے ممالک کی شاعری سے موازنہ ——— اس نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔

آٹھ دِن تک وہ کتابوں کے مطالعے میں غرق رہا اور اس دوران میں اُس نے کتنے ہی مسودے تیار کر لئے تھے۔ پھر پندرہ دِن کی فرصت نکال کر وہ دہلی کے شور و غُل سے نجات پانے کے لئے دھرمشالہ کے گوشۂ تنہائی میں آ بیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دس بارہ دِن تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دِل میں دفن افسانوں کو دہرا لے، اپنے دِل میں مچلنے والے جذبات کو گیتوں کا رُوپ دے اور پھر کالج میں تین لیکچر دے کر واپس دہلی چلا جائے۔ یہ تھا اس کا پروگرام۔

لیکن دھرمشالہ کے ہوٹل کی تنہائی میں بھی اُس کو وہ سکوُن میسّر نہ ہوا جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ اِس لئے اب وہ روزانہ صبح کو کسی بس میں سوار ہو جاتا اور جہاں جی چاہتا اُتر جاتا۔ اس کے ساتھ صرف ایک چھوٹا سا تھیلہ ہوتا۔ جس میں وہ ایک ڈبل روٹی، مکھن، انڈے اور کچھ پھل رکھ لیتا، تھرمس میں چائے ہوتی، سگریٹ کی دو ڈبیاں جیب میں ڈال لیتا۔ کھدّر کی ایک پتلی چادر اور ہَوائی تکیہ کو تہ کر کے تھیلے میں رکھ لیتا۔ جہاں جی چاہتا گھُومتا، جہاں جی میں آتا اپنی نیلی چادر پھیلا کر تکیہ میں ہَوا بھر کر لیٹ جاتا۔ اِس طرح دِن گزارتا شام کے وقت کسی گاؤں کے نزدیک پہنچ جاتا اور کسی

گزرتی ہُوئی بس میں سوار ہو کر رات گئے تک اپنے ہوٹل میں لوٹ آتا ———

اِس طرح کوئی تین دِن گزر رہے تھے اور چوتھے دِن جب وہ سارا دِن ایک گاؤں کے لہلہاتے کھیتوں میں گزار کر واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک پتھر پر سے اُس کا پاؤں کچھ اس طرح پھسلا کہ سنبھلتے سنبھلتے بھی موچ آگئی اور دیکھتے دیکھتے اُس کی ایڑی سوج گئی۔ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ سائے ڈھل چُکے تھے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں آگے بڑھنے کی سکت نہ تھی۔

اب وہ کسی راہگیر کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف سے کچھ آہٹ سنائی دی۔ بانس کے پیڑ کے پاس ایک لڑکی پتے توڑ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا اِس لڑکی کی بجائے اگر کوئی مرد ہوتا تو اس سے مدد مانگتا۔ اس کے سہارے کچھ دُور چل لیتا۔ لڑکی نے پتّوں کا گٹھڑ باندھ لیا اور سر پر رکھ کر چل دی۔ جب اُس کے پاس سے ہو کر گزری تو کہنے لگی۔ "کیوں بابو راستہ بھُول گئے ہو کیا؟"

اگرچہ لڑکی کی زبان پہاڑی تھی۔ مگر اس کے سمجھنے میں چنداں دُشواری نہ ہوئی۔ ہردیو نے اُس کو بتانے کی کوشش کی کہ اُس کے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے اور وہ چل نہیں سکتا۔ پھر اُس سے کہا کہ وہ گاؤں پہنچ کر کسی آدمی کو بھیج دے، جس کے کندھے کا سہارا لیکر وہ گاؤں تک پہنچ سکے۔ لڑکی نے پتوں کا گٹھڑ زمین پر رکھ دیا اور ہردیو کے تھیلے کو اپنے پانی کے برتن پر ٹکا کر اُس سے بولی کہ وہ اُس کے کندھے کا سہارا لینے کی کوشش کرے۔ کوئی تنومند شخص بھی ہوتا تو ہردیو کے سہارے اِتنی آسانی سے نہ چل سکتا تھا جتنا کہ وہ اِس دوشیزہ

کندھے پر ہتھیلی رکھ کر چل رہا تھا۔ ہر قدم پر اُسے اِس بات کا خیال رہتا کہ کہیں وہ زیادہ دباؤ نہ ڈالے اور دِل ہی دل میں اپنے لنگڑاتے پاؤں سے جیسے عرض کرتا جا رہا ہو ـــــ کچھ تو صبر سے کام لے۔

جب ہردیو گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا۔ لڑکی اُسے اپنے گھر لے گئی۔

"میں تمہیں کیا کہہ کر پُکاروں؟" ہردیو نے پُوچھا۔

"میرا نام برہمی ہے بابُو!"

"تم مجھے بابو کیوں کہتی ہو؟ میرا نام تو ہردیو ہے۔"

"تمہارا نام بڑا مُشکل ہے بابُو۔"

"مُشکل ہے تو آسان بنالو ـــــ کہو تو بھلا دیو۔"

"دیو۔" برہمی نے آسانی سے کہدیا۔

"برہمی! اِس گاؤں میں کوئی سرائے تو ہوگی یا پھر کوئی مندر۔ . . . . میں وہیں پڑا رہوں گا۔"

برہمی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کو دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا کر کے اندر چلی گئی ـــــ کچھ دیر بعد برہمی کے باپ نے آکر ہردیو کا بازُو تھام لیا۔

"کوئی فکر نہ کرو بابُو! رات بھر یہیں ٹھہر جاؤ۔ تمہارا پاؤں سینک دیں گے۔ کل تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

وہ 'کل' جلدی نہ آئی۔ ہردیو کے پاؤں کے سُوجن کوئی تین دن تک رہی۔ برہمی کا باپ روزانہ اس کے پاؤں پر گرم تیل کی مالش کرتا اور پھر کس کر

باندھ دیتا۔ اس دوران میں ہردیو کو یہ خیال بھی ہوا کہ وہ کسی بس والے کے ہاتھ رقعہ بھیج کر اپنے ہوٹل میں خبر دے اور کسی ڈاکٹر کو بُلوائے یا ہوٹل سے کچھ ضروری چیزیں ہی منگوائے مگر پھر سوچا کہ ایسا کرنا برہمی کے جذبۂ خدمت کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ وہ جس چارپائی پر پڑا تھا وہیں پڑا رہا۔

اپنی نیلی چادر کا اس نے تہمد بنا لیا تھا۔ برہمی روزانہ اس کی قمیض دھو دیا کرتی تھی۔ خالص اُون کے دو پٹو برہمی کے باپ نے اس کی چارپائی پر بچھا دئے تھے۔ برہمی کی ماں اُس کے لئے چاول اُبالتی تھی، دال پکاتی تھی اور پیٹھے کی سبزی تیار کرتی تھی۔ پھر بھی برہمی کو جیسے کوئی کمی محسوس ہوتی ـــ وہ پڑوسیوں سے دھان اور مکّی کے بدلے تھوڑا سا گیہوں کا آٹا بھی لے آئی تھی۔ اور اس کے لئے ہلکی پھلکی چپاتیاں سینکنے کا اہتمام کرتی۔

چوتھے روز ہردیو کے پاؤں میں اتنی سکت آگئی کہ وہ چارپائی سے اُٹھ کر برہمی کے چُولھے کے قریب بیٹھنے لگا۔ گیلی لکڑیاں بار بار دھواں چھوڑتیں، ہردیو لکڑیوں کو پھونکوں سے سُلگانے کی کوشش کرتا اور برہمی چپاتیاں بیلتی جاتی۔

دیوالی قریب آرہی تھی۔ برہمی کی ماں اپنے کچّے مکان کی لپائی کرنے کے لئے تمام چیزیں مہیا کر چُکی تھی۔ ہردیو کو پہلی بار پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی ـــ سوندھی سوندھی سُگندھ اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس خوشبُو کے آگے دُنیا کی تمام خوشبوئیں ہیچ ہوں۔ آنگن کی لپائی کرتے وقت برہمی کی ماں گیروا رنگ گھول کر سارے آنگن میں پاؤں کے نشان بنانے لگی تو اُس نے پُوچھا

"یہ کیا برہمی ؟"

"ماں کہتی ہے کہ یہاں پاؤں رکھ کر لچھمی آئے گی ۔" برہمی نے اُسے بتایا۔

ہردیو کے دِل میں اس کے اِس معصوم اعتقاد کے لئے تعظیم کے جذبات اُبھر آئے۔ اُس نے ہنس کر پُوچھا: ۔

"سچ برہمی ! لکشمی آئیگی تو مجھے دِکھاؤ گی ؟"

" واہ ! لچھمی بھی کبھی دِکھائی دیتی ہے ۔" برہمی ہنس کر بولی۔

"کبھی کبھی تو دکھائی دے ہی جاتی ہے ۔"

"کب ؟"

"جب وہ دِکھائی دیتی ہے تو اُس کا نام بدل جاتا ہے ۔"

برہمی اُس کا مُنہ تکتی رہ گئی ۔

"کبھی کبھی اُس کا نام برہمی بھی ہو جاتا ہے ۔" ہردیو نے کہا ۔

برہمی کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ ہردیو کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اگرچہ اُسے دُنیا بھر کے مشہور مصوروں کے شاہکار دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔ مگر ایسا پاک حُسن اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

برہمی کے باپ نے اپنے 'بابو' کی خاطر مدارت کے لئے ایک دن شہر سے ڈبل روٹی اور انڈے منگوائے ۔ ہردیو کو لاکھ کہتا رہا کہ اب اُسے مکی کی روٹی اور اُبلے چاولوں کے سوا اور کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مگر برہمی اور اُس کے گھر والوں کو مہمان نوازی میں ابھی کچھ کسر معلوم ہو رہی تھی ۔

برہمی نے آگ جلائی۔ ہردیو نے توا رکھ کر برہمی کو انڈے تلنے کا طریقہ بتایا ۔ برہمی چائے تیار کر رہی تھی۔ لکڑیاں بُجھ بُجھ جاتی تھیں ہردیو نے کتنی ہی پھونکیں ماریں۔ مگر لکڑیوں نے آگ نہیں پکڑی ۔ برہمی نے زور سے ایک پھونک ماری تو دھوئیں کے بادلوں میں سے ایک شعلہ لپکا۔ چُولھے پر جھکی ہوئی برہمی کا چہرہ منور ہو گیا ۔

ہردیو کو پہلی بار یوں لگا کہ برسوں سے اُس کے دل میں جو آگ سُلگ رہی تھی اور دُھواں گھُٹ رہا تھا آج اُس میں کسی نے ایسی پھونک ماردی کہ وہ روشن ہو گئی ۔ ایک شعلہ لپکا۔ جس کی روشنی میں برہمی کا چہرہ منوّر ہو اُٹھا ۔ اُس کے لئے برہمی اب محض ایک لڑکی نہیں تھی۔ انسان کی پاک محبت کی زندہ جاوید تصویر تھی۔

اگلے دِن برہمی نے ایک عجیب بات کی ۔ اچانک وہ ہردیو سے مخاطب ہو کر بولی ۔

" دیو بابو ! تم نے کہا تھا نا کہ لچھمی جب دِکھائی دیتی ہے تو اس کا نام بدل جاتا ہے ۔"

" ہاں !"

"کیا لچھمی کبھی کبھی مرد بھی بن جاتی ہے ؟"

یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہردیو لاجواب ہو گیا تھا۔ وہ برہمی کا مُنہ تکتا رہ گیا ۔

ہردیو کے ہوائی تکیہ میں برہمی بڑے شوق سے مُنہ لگائے ہوا بھرتی تھی ۔ جب وہ بھر جاتا تھا تو ہردیو اس کے ساتھ اپنا چہرہ یوں لگا دیتا جیسے اُس میں سے برہمی کی سانسیں آرہی ہوں

انہیں خیالوں میں غلطاں ہردیو نے سر اُٹھایا۔ دیو اُس کے پاس کھڑا تھا۔ ہردیو نے گرم سلیٹی پتلون پہن رکھی تھی اور دیو نے اپنی کمر کے گرد نیلی تہمد۔

"دیو!"

"ہاں دوست!"

"تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"میرے اور کوئی جگہ نہیں رہی ہردیو! میں یہیں رہونگا"

"یہاں، برہمی کے گھر؟"

"میں کسی اور کود کھائی تھوڑی دوں گا جو تجھے غم ہو۔"

"تم یہاں کیا کرو گے؟"

"برہمی جنگل میں چشمے پر اکیلی پانی بھرنے جاتی ہے۔ میں اُس کے ساتھ جایا کروں گا۔ وہ کھیتوں میں جاکر دھان کاٹتی ہے میں اُس کا گھٹڑ اُٹھوایا کروں گا۔ وہ چُولھے کے سامنے روٹیاں پکاتی ہے میں آگ سلگایا کروں گا۔"

"وہ کچھ عرصے کے بعد جب اپنی سُسرال چلی جائے گی پھر؟"

"میں اُس کی ڈولی کے ساتھ ساتھ جاؤں گا۔ وہ اپنا گھر بسائے گی تو میں اُسے آراستہ کروں گا، سجاؤں گا۔"

"مگر دیو تمہارا اُس کے ساتھ رشتہ کیا ہوگا؟"

"یہی تو دُنیا والوں کی بُری عادت ہے کہ وہ ہر انسان کا دُوسرے انسان سے رشتہ جاننا چاہتے ہیں۔ وہ انسان کو بعد میں دیکھتے ہیں اور رشتہ پہلے۔ کیا عورت کا چہرہ عورت کا چہرہ نہیں ہوتا؟ کیا وہ ضرور ماں کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ بہن کا چہرہ ہونا چاہیے بیٹی کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ بیوی کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ صرف عورت کا چہرہ کیوں نہیں رہ سکتا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو دیو! میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں"

"کم از کم تمہیں تو یہ سوال نہیں پُوچھنا چاہیئے۔"

"میں کچھ نہیں پُوچھتا۔"

"آج تم نے اپنے ہوائی تکیے کو خالی نہیں کیا ہردیو؟"

"اِس کو برہمی نے اپنی سانسوں سے بھرا ہوا ہے۔"

"تو پھر؟"

"جب تک ممکن ہوگا اُس کی سانسوں سے ملاکر سانس لُونگا۔"

"مگر کتنے دِن ہردیو؟ تیری دُنیا کی ہوا اِس دُنیا سے مختلف ہے۔ ہ تہذیب و تمدن کی دنیا ہے۔ اس میں ہر گھڑی نفرت اور جنگ کے اثیم پرورش پاتے ہیں۔ اور یہ تہذیب اور تمدن کی دوڑ میں پیچھے ہ جانے والی دُنیا ہے۔ اس میں مُونج اور مکی کے خوشے سانس بتے ہیں تیری دُنیا کی فضاؤں میں تو برہمی کا دم گھُٹ کر رہ جائے گا۔"

ہردیو نے کچھ جواب نہ دیا۔ تکیے کا پیچ کھول دیا۔

ایک لمحے میں برہمی کی سانسیں ہردیو کی سانسوں سے آزاد گئیں اور مونج اور مکی کے کھیتوں سے آنے والی ہوا میں تحلیل ہوگئیں۔

مُلاقات

جگجیت جب آئینہ کے سامنے آئی تو اُس کی پُشت کی طرف اُس کے دراز اور گھنے بالوں کی گھٹا سی اُمڈ آئی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی دراز زلفوں کو یوں پکڑا جیسے اِن اُمڈی گھٹاؤں کو جلد از جلد سمیٹ لینا چاہتی ہو۔

"خبر سُنی؟" ایک آواز نے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ـــــ" جگجیت خاموش رہی۔

"وہ اِسی شہر میں آیا ہے۔"

جگجیت اب بھی چُپ رہی۔

"پیغام مِلا؟"

"پیغام لفظوں کا محتاج نہیں۔"

"مِلوگی؟"

"معلُوم نہیں۔"

"رات بھر بے چین رہی ہو۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی راتیں کئی ہوتی ہیں۔"

"مگر کبھی کبھی کوئی سوئی ہوئی چنگاری کو پھونک مار کر جگا ہی دینا ہے؟"

"اور روشنی تیز ہو جاتی ہے۔"

"حیات تنکوں کے ظہور کی ترتیب کا نام ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"اگر سُلگتے رہنا ہی میرے نصیب میں ہو۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا زندگی کے چشموں میں پانی نہیں رہا؟"

"زندگی کے چشموں میں نہیں۔ مگر دراز پلکوں کی جھیلوں میں بہت پانی ہے۔"

"لب تسکین پا سکیں گے؟"

"یہ لفظ تو کبھی نہیں سُنا میں نے۔"

"تمہیں اس سے مِلنا ہوگا جگجیت۔"

"تم بھُول رہی ہو کہ اب میں آزاد نہیں ہوں۔"

"یاد ہے۔"

"اور پھر اسے دینے کے لئے میرے پاس رکھا بھی کیا ہے؟ ایک اقرار بھی تو نہیں۔"

"میں سمجھتی ہُوں۔"

"پھر؟"

"جس "محبُوبہ" نے تمہارے دِل میں جنم لیا تھا۔ کیا "بیوی" اور "ماں"

کے دو لفظ اس کی آنکھیں بند کر سکیں گے؟"

"نہ بھی کر سکیں تو بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک لامتناہی اندھیرا ہے۔"

"مگر اس کی سانسیں برقرار ہیں اور دِل بے قرار"

"پھر تم ہی کہو کہ کیا کروں؟"

"تمہیں وہ کیسی لگتی ہے، تمہارے اندر کی محبُوبہ؟"

"کبھی کبھی اُس کی گرم آہوں کی میں تاب نہیں لا سکتی۔ یہاں تک کہ میرے اندر جو 'بیوی' اور 'ماں' ہیں وہ بھی خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔"

"بیوی زِندہ رہے، ماں بھی زِندہ رہے، کیا اُس کو جینے کا کوئی حق نہیں؟"

"تمہیں کہو اسے کہاں رکھوں؟ میری تنگ دامانی کو تو دیکھو۔"

"دھرتی بہت وِشال ہے۔"

"مگر دھرتی پر محبّت کے دو قدموں کے لئے کوئی بھی جگہ نہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔

"جواب نہیں دیا تم نے؟" جگجیت نے پُوچھا۔

"جواب تمہارے اندر ہے جیتی"

"مجھے تو بُلند آواز بولنے کی آزادی نہیں۔"

"ہا ہا . . . ۔"

"تمہیں مجھ پر ہنسنا نہیں چاہیئے"

"اچھا میرے آنسو تمہیں تسکین دے سکیں گے؟"

"آنسو کب تسکین دیتے ہیں۔ میں برسوں رو کر دیکھ چکی ہوں"

"اس سے مِلنا ہوگا جگجیت۔"

"جب وہ میری طرف دیکھتا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے زخم کو ناخن سے کُرید رہا ہو۔"

تم چاہتی ہو کہ زخم مندمل ہو جائے؟"

"زخم لگانا اور اسے مندمل کرنا اپنے اختیار کی بات نہیں۔"

"پھر؟"

"درد اتنا نہ ہو کہ برداشت نہ کر سکوں۔"

"ضبط کی چادر تان کر تمہیں نیند آجائے گی۔"

"آنکھیں ڈھانپ لُوں گی۔ یہ کون جانے گا کہ نیند آئی کہ نہیں"

"سوال تشنہ رہ جائے گا جگجیت۔"

"مگر میری وفا . . . . . ؟"

"وفا . . . ؟ وفا کوئی اوڑھنی نہیں۔ یہ تو من کی حالت ہوتی ہے۔ اِسے اوڑھا اور اُتارا نہیں جا سکتا . . . ۔"

"مگر . . . . ۔"

"دُنیا کی تہمت بھی تو دھول ہوتی ہے جیتی . . . ۔ اور اُس کی بخشی ہوئی شہرت بھی۔ جب من کے سرووَر میں نہا لیا جائے تو جسم سے یہ دونوں دُھولیں دُھل جاتی ہیں۔ سوال ایک ہی ہے جیتی کہ من کا سرووَر نِرمل ہو . . . . ۔!"

"اب تمہیں کہو کہ . . . . ۔"

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ پیغام لفظوں کا محتاج نہیں۔"

"ہاں!"

"کِس برتے پہ کہا تھا؟"

"یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اب اُس کے اور میرے درمیان لفظوں کی بھی گنجائش نہیں رہی۔"

نقرئی قہقہے گُونج گئے۔

"یہ ہنسنے کی بات نہیں!"

"یہ بھی ہنسنے کی بات نہیں جچتی، تو اور کیا ہے۔ تمہارے اور اُس درمیان دو لفظوں کا بھی گُزر نہیں۔ . . . . پھر تم نے اُس کے اور اپنے درمیان یہ دیوارِ فرقت کیسے کھڑی کر لی؟"

"یہ دیوار میرے قدموں کے لئے ہے۔ مگر میرے اندر کچھ "باد" جیسا آزاد و بے قرار ہے۔ جو ہر حد اور دیوار کو پھلانگ جاتا ہے۔"

"تمہاری رُوح کا یہ حِصّہ جو حدُود کو خاطر میں نہیں لاتا وہ تمہیں کیسا لگتا ہے، اچھا یا بُرا؟"

"اس سے زیادہ پاک پوِتر کسی اور چیز کا مجھے کبھی احساس نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہی دراصل "میں خود" ہُوں۔ باقی سب میں "میں" نہیں۔ یا یہ "میں" بہت سے حِصّوں میں بٹ گیا ہے۔"

"یہ "میں" ایک خوشبو ہوتی ہے جگجیت! اِس کے حصّے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔"

"خوشبو آزاد ہوتی ہے۔ اور میں ـــ میں آزاد نہیں۔"

"'میں' اگر ہوتی ہے تو آزاد ہوتی ہے، ورنہ ہوتی ہی نہیں اُس کی درمیانی حالت کا کوئی وجود نہیں۔"

"تو کیا اِس "میں" کو زِندہ رکھنے کے لئے میرے قدموں کو شکست ہوگی؟"

"تم اِس کو شکست کیوں کہتی ہو؟"

"شکست میں نے شاید ٹھیک نہیں کہا۔ ضِد قدموں کی نہیں میرے قدموں کے گرد گھیرا ڈالنے والے اصولوں کی ہے۔"

"اصولوں کی رسائی قدموں تک ہے، خیالوں تک کیوں نہیں؟"

"شاید اِس لئے کہ قدم دِکھائی دیتے ہیں، خیال نہیں۔"

"تو کیا اصُول اُن چیزوں کے لئے بنے ہیں جو دِکھائی دیں؟

جگجیت لاجواب ہوگئی۔

"رات کی تاریکی میں کچھ دِکھائی نہیں دیتا۔ قدم اُس وقت بھی ہوتے ہیں، اصُول اس وقت بھی ہوتے ہیں۔ . . . تم اُس وقت اپنے اصُولوں کو قدموں سے علیحدہ کر سکتی ہو؟"

"نہیں"

"پھر خیال کیوں نہیں اصُولوں کی گرفت میں آئے . . . . قدموں اور خیالوں میں آخر فرق ہی کیا ہے؟"

"شاید کچھ نہیں۔ اگر خیالوں کو بھی اصُولوں کی بیڑیاں ڈال دُوں، میرا سب کچھ قیدی ہو جائے گا . . . . شاید مر جائے گا۔"

"پھر نامعلوم تمہارا قدموں کے بندھنوں میں اس قدر یقین کیوں ہے؟"

"میں خود نہیں جانتی۔"

"بندھنوں میں تمہیں کوئی یقین نہیں جچتی! یہ کبھی کسی کو نہیں ہُوا۔ اصُول

قدموں کے لئے سہارا بنے تھے۔ ۔ ۔ تاکہ قدم راہگذار کے کانٹوں سے محفوظ رہیں۔ قدم منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ اور اصول اُن کے محافظ بنیں۔ ۔ ۔ ۔ مگر دُنیا والوں نے اصولوں کو پاپوش سمجھا اور چلنا ہی بھول گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بچپن کی اس جوتی کو ہی پہنے رہے۔ بدلنے کی ہمت نہیں۔ اور پاؤں شکنجے میں آگئے۔ یہاں تک کہ چلنے کے انداز ہی بھول گئے۔ خیالوں کے بھی اصول ہوتے ہیں جگجیت ـــــ وہ خیالوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ جب پاؤں بغاوت پر آمادہ ہوں، کہا نہ مانیں۔ اُس وقت تو دو راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو سب رہنمائیاں چھوڑ کر خیال بھٹکنے لگتے ہیں، اور یا اصول بیڑیاں بن جاتے ہیں۔

"میرے ہاتھ تھام لو۔ ۔ ۔ ۔ اِن کو سہارا دو۔"

"کیا کرو گی؟"

"چلوں گی۔"

"اُس سے ملوں گی نہ؟"

"ہاں!"

"لیکن اِن راہوں پر سہارے نہیں ہوتے جگجیت! صرف قدموں کی ہمت تمہیں لے جائے گی۔"

جگجیت نے نظریں جھکا کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کے پاؤں اصولوں کی ایک تنگ جوتی کی گرفت میں تھے۔

"میں کس طرح اُتاروں اِنہیں؟"

جواب کوئی نہ مِلا۔

"کیسے اُتاروں اِنہیں؟" جگجیت نے تڑپ کر پوچھا۔

جواب اب بھی نہیں آیا۔

جگجیت نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس کے سامنے ایک قدِ آدم آئینہ تھا۔ اور آئینے میں اُس کا اپنا عکس ایک سوال کی صورت میں کھڑا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی پُشت پہ کالے سیاہ بالوں کی گھٹا سی اُمڈ آئی تھی۔ خیالوں کی گھٹا۔ اور اس کے ہاتھوں میں اِتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اِس گھٹا کو سمیٹ لیں۔

پانچ بہنیں

ایک بڑے مُلک کا قِصّہ ہے کہ ایک دِن ٹھنڈے بلوری پانیوں نے زِندگی کے خوبصورت اعضا کو مَل مَل کر دھویا۔ پھولوں نے جی بھر کر خوشبو لگائی اور سات رنگوں نے زِندگی کے لئے ایک پوشاک پیش کی۔ سُورج نے اپنی کرنوں کی وساطت سے پھلوں میں رس ٹپکایا۔ زندگی نے اپنی آنکھوں میں تسکین چھلکا کر ہَوا سے یوں کہا "میں نے سُنا ہے کہ اِس صدی کی پانچ لڑکیاں ہیں۔ جوان اور خوبصورت . . . . "

"ہاں!"

"آج میں اُن کے ہاں جاؤں گی۔"

ہَوا ہنسنے لگی۔

"میرے پاس پانچ سوغاتیں ہیں۔ ایک سی قیمتی۔ میں اِن سَب کو ایک ایک سوغات دُوں گی۔ کیا تم میرے سَاتھ چلوگی؟" زندگی نے ہوا سے

پُوچھا۔

"جیسے تم کہو۔"

"سَب سے پہلے میں پانچ بہنوں میں سَب سے بڑی کے گھر جاؤں گی۔"

"اچھا، مگر اس کے گھر میں دروازے اور کھڑکیاں بالکل نہیں صرف ایک دَروازہ ہے۔ جَب اُس کا خاوند گھر سے جَاتا ہے تو جاتے ہوئے دروازے کو لوہے کا قفل لگا دیتا ہے۔ واپسی پر وہی قفل باہر سے کھول کر اندر لگا دیتا ہے۔"

"تم مجھے اپنے اندر سمو لو۔ خوشبو کی طرح۔ اِس طرح میں تمہارے سَاتھ اس کے گھر میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں، نہیں، خوشبوؤں سے میں بوجھل ہوجاتی ہُوں لہٰذا میں کسی جھری سے بھی مکان میں داخل نہیں ہوسکتی۔ جتنی دیر میں دیواریں پھلانگ کر میں اُس کے گھر پہنچتی ہُوں، میرے جسم کا ایک ایک عضو چُور چُور ہو جاتا ہے۔"

ہَوا زِندگی کو پانچ بہنوں میں سَب سے بڑی کے گھر لے گئی۔

اِس بڑی دیوار پر بہت سی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں تصویریں . . . ہزاروں تصویریں۔ زندگی نے حیران ہوکر پُوچھا۔

"یہ دیوار صدیوں سے بنی ہوئی ہے۔ جَب اِس گھر کی کوئی عورت اِن دہلیزوں کو عبُور کئے بغیر مر جاتی ہے تو اِس مُلک کے لوگ اِس عورت کی تصویر اس دیوار پر بنا دیتے ہیں۔"

"اِس گھر کی کوئی عورت اِن دہلیزوں کو عبُور نہیں کرتی۔"

"نہیں زندگی . . . . . کبھی نہیں ۔"

"ان دیواروں کا کیا نام ہے ؟"

"روایات ! کوئی خاندان کی روایت ہے ، کوئی مذہب کی اور کوئی سماج کی . . . . ۔"

"مگر میں اس گھر کی عورت کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں"

"سورج کی کرنوں نے بھی اس گھر کی عورت کو نہیں دیکھا تم بھلا کیسے دیکھ سکتی ہو ؟"

"لیکن یہ بیسویں صدی ہے ۔ اے ہُوا ! تم کون سی صدی کی باتیں کر رہی ہو ؟"

"یہاں صدیاں گھر کے باہر سے ہی گزر جاتی ہیں ۔ دس صدیاں اِدھر ہوں یا اُدھر ۔ اِس گھر میں بسنے والوں کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔"

"میں اس کے لئے ایک سوغات لائی تھی ۔"

"تمہاری سوغات اگر اُس کے پاس پہنچ بھی جائے تو وہ اُسے ہاتھ نہیں لگائے گی ۔"

"کیوں ؟"

"کیوں کہ دُنیا کی ہر شے اس کے لئے ممنوع ہے ۔"

"کیا وہ میری آواز نہیں سُنے گی ؟"

"نہیں ، اُس کے کانوں کے لئے اِس دیوار کے باہر سے آنے والی ہر آواز کی ممانعت ہے ۔"

"اے ہُوا ! تم کیا باتیں کر رہی ہو ؟ آخر وہ جوان ہے ۔"

"اے زندگی ! تم برسوں کا حساب لگا رہی ہوگی ۔ اس گھر کی عورت کبھی جوان نہیں ہوتی ۔ بچپن میں ہی اس پر پیری کے نشانات ہویدا ہو جاتے ہیں ۔"

زندگی کے پاؤں میں ایک لرزش اٹھی ۔ وہ شکست خوردہ اور سہمی سہمی آگے چلنے لگی ۔

"یہ اِس صدی کی دُوسری لڑکی ہے ۔" ہوا نے کہا

"کون سی ؟"

"وہ جو سامنے ریلوے لائن سے کوئلے چُن رہی ہے ۔"

ایک تیس سالہ عورت نے بائیں ہاتھ سے اپنی کمر پر پھٹی ہوئی قمیص کو دوپٹے سے ڈھانپا اور دائیں ہاتھ سے اپنی ٹوکری میں ایک مٹھی بھر کوئلہ ڈالتے ہوئے کوئی دس گز کے فاصلے پر زمین پر لیٹی ہوئی اپنی بچی کو جھانکا ۔ بچی کے رونے کی آواز اب تیز ہو گئی تھی اس عورت نے ٹوکری ایک طرف رکھ دی اور اپنی بچی کو اپنی جھولی میں ڈال لیا ۔ لڑکی نے ماں کی چھاتی کو کئی بار مونہہ مارا لیکن اُسے دودھ نہ مل سکا ۔ اب وہ اور زور سے رونے لگی ۔

زِندگی نے قریب جا کر آواز دی "بہن !"

اُس عورت نے نہ جانے آواز سُنی یا نہیں ۔

زندگی نے اور نزدیک ہو کر پھر کہا "بہن"

اُس عورت نے بیگانہ نگاہوں سے ایک بار دیکھا اور پھر اپنا دھیان دُوسری جانب پلٹ لیا ۔ جیسے اُس نے سوچا ہو کہ آوازیں

کسی اور کو دی جا رہی ہیں ۔

زندگی کے ہونٹ جیسے تڑپ گئے "میری بہن"

عورت نے پھر اُس کی طرف دیکھا اور بے گانگی سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔"

عورت نے پھر اپنی توجہ اپنی روتی ہوئی بچی کی جانب مبذول کرلی۔ جیسے راہگیروں کی باتوں سے اُس کا کیا تعلق ہے؟"

"میں تیرے دیس آئی ہوں، تیرے شہر، تیرے گھر"

دیس، شہر اور گھر والی بات جیسے اُس عورت کی سمجھ سے بالا تھی ۔

"آج میں تیرے گھر رہوں گی"

عورت نے غصے سے زندگی کی طرف دیکھا۔ جیسے زندگی کا اس سے اس طرح مذاق کرنا واجب نہ تھا۔

"تم لڑکی کو دودھ کیوں نہیں دیتی ہو۔ بچاری رو رہی ہے"

عورت نے ایک بار اپنے سوکھے ہوئے جسم کی طرف دیکھا۔ پھر روتی ہوئی لڑکی کے چہرے کو لیکن اُسے اس سوال کا مطلب کچھ سمجھ نہ آیا۔ اگر اس کے پاس دودھ ہوتا تو کیا وہ بچی کو نہ پلاتی ۔

"تمہارا گھر کتنی دور ہے؟"

"اس گندے نالے کے پار"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"مگر وہاں گھر کوئی نہیں، ایک سرکنڈوں کا چھپر ہے۔"

"تیرا خاوند . . . . . ؟"

"وہ بیمار ہے؟"

"کیا کام کرتا ہے؟"

"کارخانے میں مزدور تھا۔ پچھلے سال کی تخفیف میں وہ نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔"

"اور پھر؟"

"ایک سال سے اُسے بخار آ رہا ہے۔"

"کیا یہ ایک ہی تمہاری بچی ہے؟"

"میرا ایک لڑکا بھی ہے مگر . . ."

"وہ کہاں ہے؟"

"ایک دن وہ بھوکا تھا، بہت بھوکا۔ اُس نے ایک امیر آدمی کی موٹر سے سیب چرا لیا تھا۔ پولیس والوں نے اُسے جیل میں ڈال دیا"

"میں تیرے گھر چلوں؟"

"مگر تم کون ہو؟"

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔"

"میں نے کبھی تمہارا نام نہیں سنا۔"

"کبھی . . . . . کبھی بچپن میں . . . . بچپن میں تم نے ضرور کہانیاں سنی ہوں گی۔"

"میری ماں کو بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ میرا باپ کسان تھا، مگر وہ تھا اُن کسانوں میں جن کی اپنی زمین نہیں تھی۔ میری بڑی بہن کی شادی پر ہم نے قرضہ لیا جو ہم لوٹا نہ سکے۔ ساہوکار نے ہمارے ڈنگر ڈھور

چھین لئے تھے۔ میرا باپ بہت دُور کہیں پردیس میں روزی کمانے چل دیا۔ میری ماں رات کو سو نہیں سکتی تھی۔ وہ رات کو مجھے جگا کر کہانیاں سُنایا کرتی تھی۔ بھوتوں کی، جنوں کی۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں نے تمہارا نام تو کبھی نہیں سُنا۔"

"پھر تیرا باپ کیا کما کر لایا؟"

"میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب وہ آئے گا تب وہ بہت سا سونا لائے گا۔ مگر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔" اس عورت نے سنبھل کر کہا۔

"تم میرے گھر جا کر کیا کرو گی؟"

"میں۔ ۔ ۔" زندگی کچھ اور نہ کہہ سکی۔

وہ عورت کوئلوں کی ٹوکری پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تیرے لئے سوغات لائی ہوں۔" زندگی نے رنگوں اور خوشبوؤں کی پٹاری عورت کے سامنے رکھ دی۔

"نہیں بہن! تم ان کو اپنے پاس رکھو۔" عورت نے ڈرتے ہوئے ان سے اپنی نظر ہٹا لی۔

"میں تیرے لئے لائی ہوں۔"

"نہیں بہن! کل کو پولیس والے کہیں گے کہ تُو نے کسی کی چوری کی ہے۔"

وہ عورت جلدی جلدی اپنے گھر کی جانب مڑی۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اب بھی زندگی اس کے پیچھے آرہی ہے، وہ ڈر کے مارے کھڑی ہو گئی۔

"میری بہن! تُو لوٹ جا، میرے ساتھ نہ آ۔ مجھے بیگانوں

سے بہت خوف آتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار۔ ۔ ۔ ۔ ایک جوان شہری آیا تھا اور کہتا تھا کہ میں تیرے خاوند کو کام دلا دوں گا۔ اور تیرے لڑکے کو جیل سے رہا کرا دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے پڑوسیوں سے آٹا لے کر اُس کی روٹی پکائی۔ ۔ ۔ ۔ اور جب میں اپنے لڑکے کو دیکھنے کے لئے اس کے ساتھ شہر گئی۔ ۔ ۔ ۔ تو راستہ میں۔ ۔ ۔ ۔"

اس عورت کے جسم کے ایک ایک عضو سے شعلے اُٹھنے لگے اور وہ بے تحاشا بھاگ اُٹھی۔

زندگی کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو ہوا نے اپنی ہتھیلی سے پونچھا۔ "آ، میں تجھے تیسری بہن کے گھر لے چلوں۔" جس وقت زندگی ایک محل نما گھر کے آگے سے گزری تو ہوا نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔ "یہی اس کا گھر ہے۔"

دروازے پر کھڑے دربان نے زندگی کا راستہ روک لیا۔

اس کے بعد باندی کے ہاتھ پیغام بھیجا گیا۔ زندگی باہر انتظار کرتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ انتظار کرتی رہی۔ جب اُسے اندر آنے کی اجازت ملی تو وہ خادمہ کے پیچھے پیچھے کئی بلوری دروازوں کو عبور کرتی ہوئی اور ریشمی پردوں کو اُٹھاتی ہوئی خاص کمرے میں پہنچی۔

سنگِ مرمر کا ایک مجسمہ کمرے کے ایک کونے میں ایستادہ تھا۔ پانی کی پھوار اس کے جسم کو ڈھانپ رہی تھی۔ سنگ مرمر جیسا ایک اور عورت کا مجسمہ نرم کرسی پر پڑا تھا۔ ریشم کے تار اس کے جسم کو ڈھانپنے کی

کوشش کر رہے تھے۔ عورت کے کھڑے بت کی کوئی آواز نہ آئی۔ لیکن بیٹھے ہوئے مجسمے نے پوچھا "تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں"۔

زندگی نے بدک کر چاروں طرف دیکھا، لیکن وہاں کسی عورت کا وجود نہ تھا۔ پھر زندگی نے کھڑے بت کو ہاتھ سے چھوا۔ وہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ پھر زندگی نے بیٹھے ہوئے بت کو ہاتھ لگایا۔ وہ ربڑ کی طرح ملائم تھا۔

"مجھے زندگی کہتے ہیں"۔ زندگی نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا۔ لیکن یہ نام میں نے سن رکھا ہے۔ شاید بچپن میں کسی کتاب میں پڑھا ہو"۔

"کتاب میں؟"

"ہاں مجھے یاد آ گیا۔ میری ایک ہم جماعت تھی۔ وہ گیت لکھا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے اپنے گیتوں کی کاپی دی تھی۔ اُس میں اِس نام کا ذکر تھا"۔

"اب وہ کہاں رہتی ہے"۔

"غریب لڑکی تھی۔ نہ معلوم کہاں رہتی ہوگی؟"

"مگر اس کی کاپی؟"

"اِس نئی کوٹھی میں آتے ہوئے میں پرانا سامان نہیں لائی۔ ہم نے یہ سب سامان نیا خریدا ہے"۔

"بہت مہنگا خریدا ہے"۔

"میرا خاوند ملک کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس دفعہ کے انتخابات میں بھی مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ 'بڑا آدمی' چنا جائے گا۔ ہم جب چاہیں ایسا یا اس سے اچھا سامان خرید سکتے ہیں"۔ ربڑ جیسے ملائم مجسمے نے میز پر پڑے ہوئے پھل زندگی کو پیش کیے۔

پھلوں کو ہاتھ لگاتے ہی زندگی کو بو محسوس ہوئی۔

"میں نے ابھی ابھی یہ پھل اپنے نوکروں سے تڑوائے ہیں۔ شاید خادمہ نے دھوئے نہیں۔ شاید تمہیں نوکروں کے ہاتھوں کی بدبو آ رہی ہوگی.... آج گرمی، .... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں آج ...."

"اگر تم کہو تو میں تمہیں باہر کھلی اور ٹھنڈی ہواؤں میں لے چلتی ہوں"۔ زندگی نے ایک سانس بھر کر کہا۔

"نہیں نہیں، میں ایسے باہر نہیں جا سکتی۔ اپنی برادری سے باہر کے لوگوں کے ساتھ گھومنے پھرنے سے ہماری عزت میں فرق آتا ہے.... در حقیقت جب میرا آپریشن ہوا تھا تو اس میں کچھ کسر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے درد ہوتا ہے.."

زندگی نے اُٹھ کر اس ربڑ جیسی ملائم عورت کا بازو دیکھا اور پھر اس کے جسم پر ہاتھ رکھا "تمہارا دل کیوں نہیں دھڑکتا؟.... یہ پتھر کی طرح خاموش اور سرد ہے.."

"یہاں پر ہی تو نقص رہ گیا ہے۔ میرا خاوند کہتا ہے کہ اب کے ہم کسی دوسرے دیس جائیں گے.... شاید امریکہ.... وہاں کے ڈاکٹر بہت لائق ہیں۔ میرا آپریشن دوبارہ ہوگا"۔

"کاہے کا آپریشن؟"

"جب کوئی لڑکی شادی کروا کر "بڑے گھر" میں آتی ہے تو شادی سے پہلی رات ملک کے عقلمند ڈاکٹر اس کا آپریشن کرتے ہیں۔ یہ بڑے گھروں کی رسم ہے"۔

"شادی کی رات یہ آپریشن ...."

"ہاں! اس لڑکی کے جسم کو چیر کر اس کا دل باہر نکال لیتے ہیں اس کی جگہ ایک سونے کی سِل رکھ دیتے ہیں۔ بہت خوبصورت.... بہت مہنگی...

میرے آپریشن میں ذراسی کسر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی درد اُٹھتا ہے۔ ۔ ۔ اِن انتخابات میں اگر میرا خاوند جیت گیا تو ہم اگلے مہینے ہوائی جہاز میں باہر جائیں گے۔ پھر میرا آپریشن ہوگا اور میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"میں تیرے لئے ایک سوغات لائی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ۔ ۔ میرے خاوند نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ آج کل میں کسی سے کوئی بھینٹ قبول نہ کروں۔ انتخابات نزدیک ہیں اور اس کے علاوہ ملک کی بڑی بڑی ملوں میں ہمارے حصے ہیں ہمیں یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریشم جیسی ملائم عورت نے ٹیلی فون پہ دو تین منٹ باتیں کر کے قریب بیٹھی ہوئی زندگی سے کہا "بہن اگر تمہیں میرے ساتھ کوئی کام ہو تو پھر تشریف لانا۔ اِس وقت میرا خاوند اور اسکی پارٹی کے کچھ رکن ہمارے ہاں آرہے ہیں۔ ۔ ۔"

ہوا نے زندگی کے ہاتھ کو تھاما اور اُسے سہارا دے کر چوتھی بہن کے گھر لے گئی۔ بڑا سادہ گھر تھا۔ گھر کے دروازے کے سامنے ایک چمکتی ہوئی گاڑی کا مونہہ آنکھوں کو چندھیا رہا تھا۔ رات کی آمد آمد تھی۔ زندگی نے دہلیز کے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ بائیس تیئیس سال کی ایک جوان عورت ایک بچے کو تھپکیاں دے کر سُلا رہی تھی۔ کمرے کا سامان صرف گذارے کے لئے کافی تھا۔ اس جوان عورت کے کپڑے جھللا رہے تھے۔ زندگی نے آہستہ سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

"کون۔ ۔ ۔ ذرا آہستہ" جوان عورت دہلیز کے پاس آئی "بچہ جاگ اُٹھے گا۔"

پھر جوان عورت نے بدک کر کہا "تم۔ ۔ تم؟" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔"

"مجھے علم ہے۔"

"تجھے علم ہے؟"

"میں تمام عمر تیری پرچھائیوں کے پیچھے دوڑتی رہی ہوں، اب میں تھک گئی ہوں۔ اب میں نے تیری راہ ترک کر دی ہے تم چلی جاؤ۔ ۔ ۔ جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ تم دیکھتی نہیں ہو۔ ۔ ۔ میرے دروازے کے آگے عذاب کی ایک لکیر کھچی ہوئی ہے تم اِس لکیر کو پار نہیں کر سکتیں تم اِس لکیر کو نہیں مٹا سکتیں تم چلی جاؤ۔ ۔ تم چلی جاؤ۔ ۔ ۔"

جوان عورت کا سانس پھول گیا۔

"میری اچھی بہن"

"بہن؟ میں کسی کی بہن نہیں۔ میں کسی کی لڑکی نہیں۔ میں کسی کی کچھ نہیں۔ ۔ ۔"

"یہ تیرا بچہ۔ ۔ ۔" زندگی نے کمرے میں سوئے ہوئے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا بچہ۔ ۔ ۔ میرا بچہ۔ ۔ ۔ مگر اس کا باپ کوئی نہیں"

"میں نہیں سمجھی۔"

"جب میرے دیس میں آزادی کی بنیادیں رکھی گئیں تو ان میں میری ہڈیاں ڈالی گئیں۔ ۔ ۔ جب میرے ملک میں آزادی کا پودا لگایا گیا تو میرے خون کے پانی سے اسے سینچا گیا۔ ۔ ۔ جس رات میرے دیس میں خوشی کا چراغ روشن ہوا اُس رات میری عزت اور آبرو کے دامن کو آگ لگی۔ ۔ ۔ یہ بچہ۔ ۔ ۔ یہ بچہ اُس رات کا تحفہ ہے۔ اُس آگ کی راکھ ہے۔ اس زخم کا نشان۔ ۔ ۔"

"میری دکھی بہن۔ ۔ ۔" زندگی نے ہمدردی سے جوان عورت کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"پھر میری تمام راتیں اس رات جیسی ہو گئیں۔ میں تیرے خواب دیکھا کرتی تھی میں نے سوچا کہ تو میرے سپنوں کو مہندی لگائے گی میری ماں کے آنگن میں میرے دیس کے گیت گائے جائیں گے۔ اور پھر میں اپنے کانوں سے شہنائیوں کی دھنیں سنوں

گی۔ میرے گاؤں کا ایک کڑیل جوان لڑکا میرے سپنوں کا راجہ تھا... میں تیری پرچھائیوں سے کھیل رہی تھی۔ جب ہمارا گاؤں لوٹا گیا۔ جب میرے والد کو پیٹا گیا۔ جب میرے بھائیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ ایک سانپ نے مجھے بھی ڈس لیا۔ پھر ایک اور سانپ نے .. ایک اور نے... یہ انسانی چہروں والے سانپ کس ڈھنگ کے ہیں جن کا کاٹا مرتا نہیں، ساری عمر اُس کے زہر میں جلتا رہتا ہے... پھر میں نے تیرا ایک اور سایہ دیکھا۔ میرے دیس کے لوگ کہنے لگے کہ مجھے ان سانپوں سے بچا کر لایا جائیگا ... ان کا زہر میرے جسم سے اتار دیا جائیگا۔ میں دوبارہ پہلے سی اچھی اور پاک لڑکی بن جاؤں گی... میں دوڑی تیری پرچھائیوں کے پیچھے... یہ سب جھوٹ تھا.... میرے خوابوں کے شہزادے نے مجھے قبول نہیں کیا۔ مجھے اپنی دہلیز سے لوٹا دیا۔ مجھے اپنے پاؤں سے علیحدہ کر دیا۔ پھر اُس زہر میں سڑنے لگی۔ اُن سانپوں جیسے اور سانپ میرے گرد لپٹ گئے۔ تم باہر وہ گاڑی نہیں دیکھ رہی ہو؟ کتنی چمکتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑے سانپ کی گاڑی ہے۔ آج رات یہ مجھے کاٹیگی۔“

زندگی بول نہ سکی۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سوغات اسکے آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

”یہ تم کیا لائی تھیں۔ سوغات... میرے لئے؟ تم دیکھ نہیں رہی ہو میرا سارا جسم زہر آلود ہے۔ میں جب تمہاری سوغات کو ہاتھ لگاؤں گی، اس کو زہر چڑھ جائیگا۔ ان رنگوں کو، ان خوشبوؤں کو... میری نس نس میں زہر سمایا ہوا ہے۔ زہر، زہر!!“

ہوا نے بے ہوش زندگی کے مونہہ پر اپنے دامن سے ہوا کی۔ جب زندگی کو کچھ ہوش آیا تو ہوا اُسے پانچویں بہن کے ہاں لے گئی۔

بیس سال کی ایک مدھ بھرے نینوں والی لڑکی کے ارد گرد بڑی کتابیں، ساز اور رنگ بکھرے پڑے تھے۔ زندگی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے سامنے ہی

متوارے نینوں والی لڑکی نے ساز کے تار چھیڑے اور ایک میٹھا گیت فضاؤں میں لہرا اُٹھا۔ وہ لڑکی گاتی رہی۔ ستاروں جیسے آنسو اُس کی آنکھوں میں چمکتے رہے۔ پھر اُس نے رنگوں کی پتلی لکیر سے کاغذ پر ایک رنگین تصویر بنائی۔

زندگی کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس فن کار لڑکی کے ہاتھوں کو چوم لے۔

سُروں کا، الفاظ کا اور نقشوں کا ایک جادو فضاؤں میں گھلا ہوا تھا۔ زندگی نے ایک گہری سانس لی۔ ہاتھوں میں رنگوں اور خوشبوؤں کی پٹاری لے کر آگے بڑھی۔

لڑکی نے حیرانگی سے دیکھا۔

”مجھے زِندگی کہتے ہیں!“

”مجھے علم ہے...“ لڑکی نے کہا، مگر وہ اس کے سواگت کے لئے آگے نہ بڑھی۔ اچانک زندگی کے پیر رک گئے۔ لوہے کی باریک تاریں دروازے کے آگے بنی ہوئی تھیں۔

”میں اِس وقت تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتی!“ لڑکی نے سر جھکا کے کہا۔

”کیوں؟“ زِندگی حیران تھی۔

”اگر تم کبھی رات کو آؤ، جب میں سو جاؤں، میرے سپنوں میں... جب میں جاگ رہی ہوں تو میرے جذبات میں، میں تیرے ساتھ بہت باتیں کروں گی، بہت کچھ سناؤں گی اور سنوں گی۔ پہلے بھی میں ہر روز تیری پرچھائیوں کو پکڑتی تھی۔ یہ دیکھ میں نے اِن رنگوں سے تیرے دامن کی تصویر کھینچی ہے۔ اِن تاروں کو کھینچ کر تیرے گیت گائے ہیں۔ اور اِس قلم سے میں نے تیرے پیار کے قصّے بیان کئے ہیں۔ آج جب میں خود چل کر تمہارے پاس آئی ہوں تو تم....“

”آہستہ... بہت آہستہ... میرے گھر کی سب دیواروں میں سوراخ ہیں۔

سینکڑوں ہزاروں آنکھیں میری نگہبانی کرتی ہیں۔ وہ دیکھ ان سوراخوں میں ہر سوراخ سے دو بھیانک آنکھیں نظر آئیں گی۔ یہ آنکھیں لاوے سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ایک ایک زبان سے سینکڑوں تیر نکلتے ہیں۔ اگر میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں تمہارے پاس ....تو اُن کے تیر ابھی میرے رنگ کے پیالوں کو اُلٹا کر دیں گے میرے سازوں کے تاروں کو توڑ دیں گے۔ میرے گیتوں کے ایک ایک لفظ کو زخمی کر دیں گے۔ اور ان آنکھوں کا لاوا....

”مگر یہ لوگ تیرے گیت سُنتے ہیں۔ تیری کہانیاں پڑھتے ہیں۔ تیری تصویروں کو دیکھتے ہیں۔“

”یہاں کے فن کار تیری باتیں کر سکتے ہیں۔ مگر تیرا چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔ جو تیرا چہرہ دیکھ لیتا ہے، اس مصوّر کو دار پر چڑھا دیتے ہیں۔ تم اب چلی جاؤ۔ کوئی دیکھ لے گا۔ میرے خوابوں کے علاوہ میرے پاس کوئی اور جگہ نہیں جہاں میں تمہیں بٹھا سکوں۔“

”میں تیرے لئے ایک سوغات لائی ہوں۔“

”وہ بھی میں اس وقت لوں گی۔ تم ضرور آنا میں سات بہشتیں تعمیر کروں گی۔ زندگی! تم ضرور آنا۔ میں تمہاری سوغاتوں سے اپنی بہشتوں کو سجاؤں گی۔ تم ضرور آنا...... اور صبح اُٹھ کر میں تمہاری محبت کا نغمہ لکھوں گی۔ تیرے حُسن کی تصویر کشی کروں گی۔ تیرے بانکپن کا یہ گیت گاؤں گی۔ مگر اب تم چلی جاؤ...... کوئی دیکھ لے گا۔

لڑکی نے زندگی کی طرف اپنی پیٹھ پھیر لی۔

گھائل خواب

سورج کی کرنیں جھکیں اور اس نے آہستہ سے گلاب کی ایک ٹہنی کو چھوا۔ ایک مرد کی نظریں جھکیں اور اس نے آہستہ سے رانی کے ہونٹوں کو چھوا۔ ٹہنی پر ایک پھول کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر مسکان کھل آئی۔ اس مرد نے گلاب کے پھول کو بھی سونگھا اور رانی کے ہونٹوں کو بھی۔ رانی نے پہلے گلاب کا پھول توڑا اور اس مرد کے کوٹ پر ٹانک دیا۔ پھر اپنے ہونٹ کی مُسکان چھوئی اور اس مرد کے ہونٹوں پر رکھ دی۔

رانی کی کومل، جوان باہوں کو اس مرد نے اپنی طاقتور جوان باہوں میں کسا اور رانی کے کان میں اس کے ایک ایک انگ کے لئے وہ تشبیہات استعمال کیں جو صدیوں سے ایک جوان مرد کی آواز ایک جوان عورت کے کانوں میں دہراتی آ رہی ہیں۔

روئیں روئیں سے اُٹھتی کپکپی سے رانی کی نیند اُچٹ گئی۔ گذرے ہوئے لمحات سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ مگر ان میں ایک گہری

فکر تھی کہ یہ سچ نہیں تھا، محض ایک خواب تھا۔ . . . رانی نے آہستہ سے اپنی چارپائی سے اُٹھ کر، سامنے کی الماری میں پڑا ہوا خط نکالا، کمرے کی ایک کھڑکی کھولی، صبح کی ہلکی روشنی میں خط کو پڑھا اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو تسلی دینے لگی کہ آج کا یہ خواب سچ بھی ہو سکتا تھا۔

رانی نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ایک ایک انگ کو دیکھا اور رات کے خواب میں سنی ہوئی تمام تشبیہات اس کو یاد آ گئیں — سرو کے بوٹے جیسا قد صندل کی گیلی جیسی باہیں پھلیاں جیسی انگلیاں، آم کی پھانک جیسی آنکھیں گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ۔ !

اور جس طرح ہر عورت کو مرد کے منہ سے اس قسم کی تشبیہات سن کر احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام تشبیہات صرف اسی کے انگوں کے لئے بنائی گئی تھیں۔ رانی کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ یہ تمام تشبیہات صرف اسی کے انگوں کے لئے بنی تھیں، یا اس کے انگ ان تشبیہات کے لئے بنے تھے۔

رانی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ باہر کے باغیچے میں سے گلاب کا ایک پھول توڑا اور ہونٹوں پر ایک مسکان بھر کر سامنے طویل رہگذر کی طرف دیکھنے لگی جیسے اسے خط لکھنے والا ابھی اسی رہگذر پر تیکھے تیکھے قدم رکھتا اس کے پاس آ جائے گا۔ اور اس کے ہاتھ کے تازہ پھول اور اس کے ہونٹوں پر کھلی ہوئی مسکان کو اُدھیڑے گا۔

رانی کچھ دیر سامنے کی رہگذر کو تکتی رہی، پھر اسے ایک ہلکی سی آواز آئی۔

رانی! . . . . رانی! . . . "

لیکن یہ آواز سامنے کی رہگذر سے نہیں آئی تھی۔ اس کے عقب سے رانی کی بڑی بہن کے کمرے سے آئی تھی۔ رانی نے ہولے سے انگڑائی لی اور بہن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"ہاں ملکہ! آ رہی ہوں!"

بند دروازے کو کھول کر جب وہ بہن کے کمرے میں پہونچی تو اس کی بہن نے جلدی سے کہا، "دروازہ بھیڑ دو رانی! بڑی تیز ہوا آ رہی ہے"!

"لیکن آج تو ہوا بڑی اچھی لگ رہی ہے"۔ رانی نے یکبارگی کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

"ہوا میری ہڈیوں کو چیرتی ہے مجھ سے ذرا بھی برداشت نہیں ہو سکتی"۔ ملکہ نے اپنے اوڑھے ہوئے کمبل کو کس کر دبایا اور کہا۔

"رات نیند کیسی آئی؟" چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے رانی نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج رات کیا کوئی خاص نیند آنے والی تھی روز کے مقابلے میں؟ اسی طرح اکھڑی اکھڑی جیسے روز آتی ہے"۔

رانی کچھ دیر خاموش رہی، پھر یک بیک اس کے منہ سے نکلا۔

کبھی تمہیں خواب بھی تو آتے ہوں گے ملکہ!"

رانی شاید ملکہ کے خوابوں کے بارے میں اتنا نہیں سوچ رہی تھی جتنا اپنے رات کے خواب کے بارے میں، اور خواب کا تذکرہ چھیڑ کر شاید اپنی بہن کو رات والا خواب سنانا چاہتی تھی۔

"خواب؟ خواب ہی تو ساری عمر دیکھتی رہی ہوں، کیا سوتے میں کیا جاگتے میں"۔

"یہ صبح بڑی اچھی ہے جو تمہاری اور میری جیسی عورتوں کو بہلاوا دینے کے لئے روز آ جاتی ہے"۔

"خواب سچے نہیں ہوتے"!

"خواب سچ نہیں ہوتے صرف گھائل ہوتے ہیں"!

"ملکہ"!

"چل چھوڑ ان خوابوں کی باتیں، ان کی باتیں کرتے کرتے تو میری زبان بھی

زخمی ہوگئی ہے۔“

”اٹھو ملکہ! باہر باغیچے میں چلیں، دیکھو تو باہر کیسا موسم ہے۔“

”کیسا موسم ہے“؟

”بہار کا“!

”پگلی“!

”نہیں ملکہ، سچ مچ بہار کا موسم ہے“۔

اس دنیا میں بہار کا موسم نہیں ہوتا رانی! یہ صرف ویرانی ہوتی ہے جو کبھی کبھی بہار کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔“

گھبراہٹ میں رانی کا ہاتھ اپنے سینے پر چلا گیا۔ ابھی جو خط رانی نے الماری سے نکال کر صبح کی ہلکی روشنی میں پڑھا تھا وہ اس وقت رانی کی جھولی میں رکھا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے رانی؟“

”یہ خط...“

”بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”بہت اچھا“...

”زندگی کے اقراروں سے بھرا ہوا“

”ہاں! زندگی کے اقراروں سے بھرا ہوا۔“

”یہ الفاظ تو نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔“

”لیکن ملکہ....“

”یہ سب الفاظ ڈکشنری میں ہوتے ہیں۔“

”لیکن جب کوئی خط میں لکھتا ہے...“

”تب ان کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا جب کہ ڈکشنری میں ان کا مفہوم بھی ہوتا ہے“۔

”ملکہ“!

”میرے سرہانے ایک چابی پڑی ہوئی ہے یہ چابی لے لے اور میرے سامنے کی الماری کھول کر دیکھ لے، وہاں ایک نہیں بہت سے خط پڑے ہوئے ہیں۔ تمہارے اس ایک خط جیسے کئی خط....“

”آج خواہ تم مانو یا نہ مانو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جاؤں گی، دیکھو تو تمہاری حالت دن بدن کیسی ہوتی جا رہی ہے“؟

رانی نے بڑے غور سے ملکہ کے چہرے کو دیکھا اور اسے وہ سب تشبیہات یاد آگئیں، جو اس نے رات خواب میں سنی تھیں اور رانی کو ملکہ کا وہ روپ یاد آیا جو ملکہ کے چہرے پر سماتا نہ تھا۔ حقیقتاً ملکہ بہت خوبصورت تھی ——— رانی سے کہیں زیادہ خوب صورت۔ کیونکہ اس کے تن کے روپ میں اس کے من کا روپ بھی شامل تھا۔ رانی جانتی تھی۔ وہ ملکہ کی صورت کو دیکھ کر کانپ اٹھی جیسے آج بستر پہ ملکہ بیمار نہیں پڑی ہو۔ عورت کے روپ کو دی جانے والی اس دنیا کی ہر تشبیہہ بیمار پڑی ہوئی تھی۔

رانی نے چائے بنائی، ملکہ کو پلائی، خود بھی پی اور پھر علی الصبح ملکہ کو شہر کے سرکاری اسپتال لے گئی۔

اسپتال میں بے حد بھیڑ تھی۔ رانی کبھی پہلے اسپتال میں نہیں آئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آج ساری دنیا بیمار پڑ گئی ہے۔

ڈاکٹر شری چند اسپتال کا سب سے بڑا ڈاکٹر تھا۔ رانی نے اس کے کمرے کا پتہ دریافت کیا اور ملکہ کو کمرے کے باہر ایک گوشے میں بٹھا کر اس سے ملنے کا انتظا

کرنے لگی۔

دوپہر ہونے کو آئی، ملکہ کے زرد رنگ پر ایک اور زردی چھاگئی۔ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ملکہ نے آہستہ سے کہا: "کیوں مجھے بیگانے دَر پر لاکر مارتی ہے۔ مرنا ہی ہے تو اپنی چارپائی پر پڑی پڑی مروں گی۔۔۔۔۔۔ اپنے دروانے کے آگے۔۔۔۔"

"بس اگلی باری ہماری ہے، اب تو سارے مریض فارغ ہو گئے۔"

آخر ملکہ کی باری آئی۔

رانی نے اسے اپنی بانہہ کا سہارا دیا۔ اور ڈاکٹر کے کمرے میں لے گئی۔

ڈاکٹر نے میز پر رکھے ہوئے اسپتال کے فارم کو دیکھا۔ اور ہاتھ میں قلم پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا نام ہے مریض کا؟"

"ملکہ"

"ملکہ" ڈاکٹر نے مریض کے کپڑوں اور بکھرے ہوئے روپ کو دیکھا، اور مسکرا کر کاغذ پر لکھا "ملکہ"۔

ملکہ کے ماتھے پر ایک ہلکی سی تیوری چڑھی اور پھر اس نے ہنس کر کہا "یہ کوئی عجیب بات نہیں میرے پاس ایک بہت بڑی سلطنت ہے اس لئے میرا نام ملکہ ہے!"

ڈاکٹر شاید سلطنت کا نام پوچھنے والا تھا۔ لیکن جب اس نے ملکہ کی آنکھوں کی جانب دیکھا تو اس کی نظر بڑی سنبھلی ہوئی اور تیکھی تھی ــــ ڈاکٹر نے صرف اتنا کہا کہ "کیا تکلیف ہے؟"

"ایک تو مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ کسی بھی چیز سے نہیں مٹتی اور دوسرے مجھے پیاس بھی بہت لگتی ہے۔۔۔۔"

"اس کو غیر قدرتی بھوک کہتے ہیں۔

"معلوم نہیں اس کو غیر قدرتی بھوک کہتے ہیں یا قدرتی بھوک۔ کئی بار شیشیوں پر غلط لیبل بھی لگ جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر قدرے چونکا۔ مگر پھر اس نے سنبھل کر ملکہ کو کمرے کے دائیں گوشے میں رکھے ہوئے، تخت پوش، پر لیٹنے کو کہا جہاں وہ مریضوں کا معائنہ کرتا تھا۔

ملکہ لیٹ گئی۔

ڈاکٹر نے گھنٹی بجائی، اور دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

چند منٹ گذرے۔ ڈاکٹر نے پھر گھنٹی بجائی، لیکن کوئی بھی اندر نہ آیا۔

"نامعلوم سسٹر کہاں چلی گئی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کو پھر ایک بار دبایا۔

چپراسی اندر داخل ہوا۔

ڈاکٹر نے کسی قدر غصے میں چپراسی سے کہا کہ وہ جلدی سے نرس کو ڈھونڈھ کر لائے۔

"ابھی نرس کا کوئی کام نہیں ڈاکٹر!" ملکہ نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن نرس کے آئے بغیر میں آپ کے پاس آکر آپ کا معائنہ نہیں کرسکتا۔ کوئی مرد ڈاکٹر کسی مریض عورت کے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا جب تک کوئی نرس موجود نہ ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"یہ گواہی دینے کے لئے کہ ایک صحت مند ڈاکٹر نے ایک بیمار عورت کے جسم کو ہاتھ لگایا ہے تو کسی بُری نیت سے نہیں۔" ملکہ ہنس پڑی۔ وہ بیمار تھی لیکن اس کی ہنسی بیمار نہیں تھی۔

"ہاں! اسی لئے۔"

”یعنی ایک مرد کا ہاتھ جب کسی عورت کے جسم کو چھوتا ہے تو اس کا اصل سبب ایک ہی ہو سکتا ہے . . . . چاہے وہ ہاتھ ڈاکٹر کا ہو اور وہ جسم مریض کا. . .“!

”یہ ہمارے اسپتال کا اصول ہے . . . .“

”ہماری دنیا میں اتنی گیہوں کی فصل نہیں ہوتی یا کسی بھی اناج کی، جتنی اصولوں اور قانونوں کی فصل ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر نے چونک کر مریضہ کی طرف دیکھا۔ غالباً کچھ کہتا، مگر کمرے میں نرس آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے مریضہ سے کچھ کہنے کے بجائے نرس سے کہا۔

”ایک مریض کو دیکھنا ہے۔“

نرس ملکہ کے پاس ٹھہر گئی۔ اور ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جسم کے کسی حصے میں درد بھی ہوتا ہے“؟

”ہر عضو میں . . . .“ ملکہ نے بتایا۔

ڈاکٹر نے اسٹیتھیسکوپ لگا کر اس سے کہا، ”لمبی لمبی سانس لیجئے۔“

”میں ہمیشہ ہی لمبی سانس لیتی ہوں۔“

”سانس لینے میں زحمت ہوتی ہے“؟

”ہر سانس لینے میں . . . .“

ڈاکٹر نے ملکہ کے جگر کو دیکھا، ”جگر بڑھا ہوا نہیں۔“

”اگر بڑھا ہوا نہیں تو گھٹا ہوا ضرور ہوگا“۔ ملکہ نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر نے ایک گہری نظر ملکہ پر ڈالی اور پھر نرس سے کہا ”خون کی جانچ کرنی پڑیگی، اس کے بعد ہی، کچھ کہہ سکوں گا“۔ ڈاکٹر اپنی کرسی پر بیٹھ کر سامنے رکھے ہوئے اسپتال کے سرکاری کاغذات کی خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے ملکہ سے دریافت کرنے لگا۔

”عمر“؟

”یہی جب انسان زندگی کی ہر شے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے اور پھر سوچتا ہی چلا جاتا ہے . . . . تیس بتیس سال . . . .“

”آپ کے مالک کا نام“؟

”میں گھڑی یا سائیکل نہیں ہوں کہ میرا کوئی مالک ہو، میں عورت ہوں۔“

”میرا مطلب ہے کہ آپ کے شوہر کا نام“؟

”میں بے کار ہوں، نوکری نہیں کرتی۔“

”میں نوکری سے متعلق نہیں پوچھ رہا ہوں۔“

”میرا مطلب ہے کہ میں کسی کی بیوی مقرر نہیں ہوئی۔“

”بیوی مقرر نہیں ہوئی . . . .“

”میرا مطلب ہے کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام پر لگا ہوتا ہے، جیسے آپ ڈاکٹر مقرر ہوئے، یہ میرے قریب کھڑی ہوئی لڑکی نرس مقرر ہوئی، آپ کے دروازے کے باہر کھڑا ہوا شخص چپراسی مقرر ہوا۔ اسی طرح جب لوگ شادی کرتے ہیں تو مرد شوہر مقرر ہوتا ہے اور عورتیں بیویاں مقرر ہوتی ہیں۔“

ڈاکٹر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم کو اس طرح جھٹکا کہ جیسے قلم میں سیاہی رک گئی ہو۔

”کیوں ڈاکٹر! ٹھیک نہیں“؟ کئی پیشوں میں تو لوگ ترقی بھی کر جاتے ہیں جو آج میجر مقرر ہوتا ہے وہ کل کرنل بن جاتا ہے، بریگیڈیر بن جاتا ہے، جنرل بن جاتا ہے۔ لیکن اس شادی کے پیشے میں کبھی کسی کی ترقی نہیں ہوتی۔ بیویاں تمام عمر بیویاں ہی مقرر رہتی ہیں۔ خاوند تمام عمر خاوند ہی مقرر رہتے ہیں۔“

”ان کی ترقی ہو بھی تو کیا. . . .“ ڈاکٹر ایک سوال اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔

”ترقی بھی ہو سکتی ہے مگر میں نے کبھی ہوتے دیکھی نہیں۔“

”لیکن کیا ہو سکتی ہے“؟

”یہی کہ آج جو خاوند مقرر ہوا ہے کل محبوب بن جائے۔ کل جو محبوب بنے پرسوں خدا بن جائے۔ . . . یہ رشتہ جو صرف ایک رسم کے سہارے ٹھہرا ہوتا ہے بڑھتے بڑھتے دل کا سہارا حاصل کرلے . . . . . روح کا سہارا لے لے . . . .“

ڈاکٹر نے کہا کچھ نہیں، صرف میز کے خانے سے ایک سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

نرس نے خون کی جانچ کرنے والے ڈاکٹر کو بلایا، اور ڈاکٹر نے ملکہ کی انگلی سے خون کے چند قطرے لے کر شیشی کی ایک نلی میں بھر لئے۔

ڈاکٹر شری چند نے اسپتال کے فارم پر کچھ لکھا اور وہ فارم نرس کو تھماتے ہوئے بولا ”مریضہ کو بیس نمبر وارڈ میں لے جاؤ، آٹھ نمبر کا بیڈ خالی ہے وہ دے دو۔“

رانی نے ملکہ کو بانہہ کا سہارا دے کر اٹھایا اور ڈاکٹر نے تنبیہا کہا کہ ”مریضہ کے پاس کوئی روپیہ پیسہ یا زیور نہیں ہونا چاہیئے۔“!

ملکہ نے اپنے دوپٹے کے دامن سے کچھ باندھ رکھا تھا، اس کی طرف دیکھتی ہوئی ڈاکٹر سے کہنے لگی، ”میرے پاس کچھ قیمتی سکے ہیں، ان کا کیا کروں“؟

”ان کو آپ اپنے پاس نہیں رکھ سکتیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”رکھ میں دنیا میں بھی نہیں سکتی تھی، لیکن جیسے تیسے سنبھالتی آئی ہوں۔“ ملکہ نے اتنی آہستہ آواز میں کہا جیسے اس نے خود بھی بدقت تمام سنا، اور اس نے دوپٹے کے دامن سے بندھی ایک چھوٹی سی لال رنگ کی پوٹلی کھولی اور رانی کو تھماتے ہوئے کہا، ”بڑے ہی قیمتی سکے ہیں . . . سنبھال کر رکھنا۔“

ملکہ کو جب بیس نمبر وارڈ میں لے گئے تو اسے لوہے کے پلنگ پر لٹا کر پہلی نرس نے اسے دوسری نرس کو سونپتے ہوئے کہا ”مریض نمبر ۸“

ملکہ مسکرا اٹھی اور رانی سے ہولے سے بولی ”یہ نمبروں کی بات مجھے بڑی اچھی لگی۔

”کیوں؟“

”کیوں کہ یہاں کسی بھی مریض کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مریض نمبر سات . . . مریض نمبر آٹھ . . . . مریض نمبر نو . . . . یہ نام تو بنے تھے آدمی کی شخصیت بنانے کے لئے، لیکن کسی بھی آدمی کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ ناموں کی بات جھوٹی ہوتی ہے یہ نمبروں کی بات پھر بھی سچی ہے . . . .“!

رانی نے دکھ کو سہتے ہوئے ملکہ کے شانوں کو چوما، اور پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے وارڈ کے باہر چلی آئی۔

اس وارڈ میں اب چھ مریض تھے۔ ملکہ اپنے ساتھ کی پانچ مریض عورتوں سے دھیمی آواز میں ان کا حال پوچھنے لگی۔ ایک بالکل پیلی پڑی ہوئی عورت کو چھوڑ کر باقی چاروں عورتیں غریبی اور بڑھاپے سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے کراہ رہی تھیں۔ پانی کا گھونٹ ایک پل اندر جاتا اور دوسرے پل باہر نکل آتا تھا، ان کی آرزوؤں کی طرح . . . .

ڈاکٹر جب شام کا چکر لگانے آیا تو ملکہ سے حال پوچھتے ہوئے بولا۔

”رات کو نرس آپ کو نیند آور گولی دے دے گی۔“

”کوئی خاص ضرورت نہیں، میں تھوڑا بہت سو ہی لوں گی“!

”یہاں شاید آپ کو حسب معمول بھی نیند نہیں آئے گی اس لئے کہ اکثر مریض رات میں دن سے زیادہ کراہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو کینسر ہے، دوسری

کے زخموں میں پانی بھرا ہوا ہے، اور یہ آپ کے قریب کی چارپائی پر پڑی ہوئی عورت ہے۔"

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر! مجھے یہ چیخیں اور کراہیں سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہماری دُنیا میں وہ کون سی جگہ ہے جہاں رات کو لوگ سکھ کی نیند سوتے ہیں؟ کسی کے ہاتھ گھائل، کسی کا پیر گھائل، کسی کا خواب گھائل۔۔۔" ملکہ نے کھڑکی کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ملکہ کے زرد اور نرم چہرے کو کتنی ہی دیر تکتا رہا، پھر ہاتھ میں لئے ہوئے ایک کاغذ کو دیکھ کر بولا "آپ کے خون کی جانچ کا نتیجہ آگیا ہے مگر۔۔۔"

"کیا عجیب نکلا ہے میرے خون میں"؟

"سرخ جراثیم۔۔۔ سفید جراثیم۔۔۔ سب ٹھیک ہیں، کسی جانی پہچانی بیماری کے جراثیم بھی اس میں نہیں ملتے۔۔۔۔ مگر کچھ عجیب طرح کے جراثیم اس میں ملے ہیں۔ جنہیں ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ کون سے جراثیم ہیں۔"

ملکہ مسکرائی۔ اس کی آواز دن بدن بڑھتی ہوئی تکلیف سے دھیمی ہوئی جا رہی تھی مگر اس کی کوملتا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی دھیمی اور کومل آواز میں اس نے کہا۔ آپ جتنے دن چاہیں ان جراثیم کو پرکھ لیں، اور اگر پھر بھی آپ کچھ نہ سمجھ سکیں تو میں بتاؤں گی کہ یہ جراثیم کون سے ہیں"؟

ڈاکٹر نے بڑی گہری نظر سے ملکہ کو دیکھا، اور پھر کسی قدر تعجب انگیز لہجے میں بولا۔

"آپ جانتی ہیں؟"

"ہاں!"

"ہم سب ڈاکٹر آج انہیں پرکھتے جانچتے تھک گئے ہیں، سوچ رہے تھے

کہ آپ کے خون کے کچھ قطرات کسی اور ملک کے ڈاکٹر کو بھجوائیں، دوسرے ممالک کی سائنس ہمارے یہاں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے"

"بھیج کر دیکھ لیجیے، شاید وہ بھی نہ جان سکیں۔"

"لیکن آپ نے یہ کیسے کہا کہ آپ جانتی ہیں؟"

"کیوں کہ میں "حقیقتاً" جانتی ہوں!"

"پھر آپ فوراً ہمیں بتا دیجئے۔"

میں بتا دیتی ہوں۔ لیکن آپ یقین نہیں کریں گے۔"

"آپ اس کا علاج بھی جانتی ہیں۔۔۔۔؟"

"ہاں!"

"پھر آپ وہ علاج کرتی کیوں نہیں؟"

"میں اپنا آپریشن آپ کیسے کر سکتی ہوں، وہ تو آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔"

"اگر ہم آپ کا بتایا ہوا علاج کر دیں، آپ ٹھیک ہو جائیں تو ہمیں یہ سب ماننا ہی پڑے گا کہ یہ کون سے جراثیم ہیں؟"

"آپ نے پاربتی کی ایک کہانی سنی ہے کہ نہیں"؟

"پاربتی کی کہانی؟"

"کہتے ہیں، ایک بار شوجی کہیں باہر گئے ہوئے تھے، انہوں نے بہت دیر لگا دی، تب اکیلی پاربتی کا دل نہیں لگتا تھا، اس لئے اس نے اپنے جسم کا میل اتار کر ایک بچہ بنا لیا۔۔۔۔!"

ڈاکٹر کے چہرے پر ہنسی اور شرمندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا" میں اس پگلی عورت سے خواہ مخواہ مغز ماری کر رہا ہوں، معلوم ہوتا ہے اس کا۔۔۔۔۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ آپ کو مجھ پہ یقین نہیں آئے گا۔"

"یہ کوئی یقین کرنے کی بات ہے؟"

"اچھا پھر رہنے دیجئے اس بات کو۔ آپ یونہی ان جراثیم کو پہچان لیجئے، اگر جان سکیں تو......؟"

ڈاکٹر کے دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی، وہ سوچنے لگا اس عورت کے ہوش وحواس درست بھی ہیں اور نہیں بھی، اس نے صرف اتنا کہا "اچھا میں ساری بات سنوں گا، آگے بتلائیے!"

"جس طرح پاربتی نے اپنے جسم کے میل سے ایک بچہ بنا لیا تھا اسی طرح عورت ذات نے اپنے دل کے خون کو، پسینے کو اور آنسوؤں کو ملا کر مجھے جنم دیا تھا۔ اس لئے میرے خون میں آپ کو عجیب وغریب جراثیم ملے ہیں جنہیں آپ پہچان نہیں پاتے۔"

ڈاکٹر نے اپنی پیشانی پر اُبھرا ہوا پسینہ پونچھا، اور پھر پوچھنے لگا۔ "آپ کی اس بیماری کا نام کیا ہے؟"

"سوچنے کی بیماری...... ہر شے کے متعلق سوچنے کی بیماری۔"

"اس کا علاج؟"

"آپ جانتے ہیں ہر انسان کے پیٹ میں داہنی طرف ایک پتلی سی آنت (ناڑی) ہوتی ہے، کئی بار خوراک کا کچھ حصہ اس میں جمع ہو جاتا ہے جو پڑا پڑا سڑنے لگتا ہے۔ آدمی دن بدن زرد اور کمزور پڑتا جاتا ہے۔ اور اگر آپریشن کے ذریعے اس آنت (ناڑی) کو نہ کاٹا جائے تو وہ کسی دن خود ہی پھٹ جاتی ہے۔ پھر اس کا زہر سارے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور آدمی مر جاتا ہے....."

"ہاں!"

"اسی طرح انسان کے سر میں ایک رگ ہوتی ہے جس میں خیالات کا کچھ حصہ جمع ہو جاتا ہے پھر پڑا پڑا سڑنے لگتا ہے۔ کسی دن پھٹ بھی جاتا ہے اور پھر آدمی اس کے زہر سے مر جاتا ہے۔"

"اس کا ثبوت کیا ہے؟"

"ایکسرے کر کے دیکھ لیجئے۔ یہ میں نہیں جانتی کہ آپ کی سائنس نے ابھی اتنی ترقی کی ہے کہ نہیں، کہ اس رگ کی تصویر لی جا سکے، اگر آپ میری بات مانیں...."

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"کہ آپ میرے سر کا آپریشن کر کے دیکھ لیجئے، آپ کو یہ رگ ضرور مل جائیگی۔"

ڈاکٹر کچھ دیر چپ چاپ ملکہ کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر بغیر کچھ کہے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن صبح جب ڈاکٹر چکر لگانے آیا، تو ملکہ کی حالت کل سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کو ملکہ کی آواز سننے کے لئے اس کے سرہانے جھکنا پڑا۔

ملکہ کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر آپ نے میری بات نہیں مانی...... اب بھی مان لیجئے...... مجھے آپریشن والے کمرے میں لے چلئے..... میرا خیال ہے کہ میرے سر کی رگ پھٹنے والی ہے....."

ڈاکٹر نے کہا "آج ایکسرے کر کے دیکھتے ہیں۔"

"ابھی آپ کی سائنس نے اتنی ترقی کہاں کی ہے کہ...." ملکہ کی آواز ٹوٹنے لگی۔

ڈاکٹر شری چند نے برابر کے کمرے میں جا کر کچھ اور ڈاکٹروں کو ٹیلیفون

کیا کہ وہ وارڈ نمبر ۲ میں آجائیں، اور وہ جب لوٹ کر ملکہ کے پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں انجکشن لگانے کا سامان تھا۔

یہ کیا ڈاکٹر ؟“

” ہاتھ ادھر کرو، میں ایک انجکشن لگاؤں گا۔“

” دل کی طاقت کا !“

اگرچہ ملکہ کا ایک ایک انگ مرجھا گیا تھا، مگر اس کی مسکراہٹ اب بھی نہیں مرجھائی تھی۔ ملکہ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا ”دل کی طاقت کا !“

” ہاں !“

” وہ تو ڈاکٹر! پہلے ہی زیادہ ہے۔۔۔ ضرورت سے زیادہ۔۔۔ اسی وجہ سے تو میں مر رہی ہوں۔۔۔۔“

انجکشن کی سوئی کو گرم پانی سے نکالتے ہوئے ڈاکٹر کا ہاتھ کانپ گیا۔ صبح نو بجے سے بے کر گیارہ بجے تک کا وقت ملاقاتیوں کے لئے تھا۔ اس وقت دس بجے تھے۔

رانی اپنی بہن کا حال پوچھنے کے لئے آگئی تھی۔

” تو آگئی رانی“ ؟

” ہاں ! ملکہ “

” میں تجھے ہی یاد کر رہی تھی۔“

” میں آگئی ہوں۔۔۔ تیرا حال کیسا ہے ؟“

” اِدھر آ نا !“

” بول !“

” تو نے وہ میری لال پوٹلی کہاں رکھی ہے ؟“

” میں خوب سنبھال کر رکھ آئی ہوں، تو فکر مت کر !“

” اس میں بڑے قیمتی سکے پڑے ہوئے ہیں۔۔۔۔ تو نے پوٹلی کھول کر دیکھی تھی ؟“

” نہیں ملکہ ! میں نے نہیں کھولی۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر کیسے کھول سکتی ہوں۔ تم جب ٹھیک ہو جاؤ گی، مجھے خود کھول کر دکھانا۔ تم مجھے اس وقت یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کھانے کے لئے کیا دوں ؟ میں کچھ پھل لائی ہوں !“

” آج مجھ سے کچھ نہیں کھایا جاتا۔۔۔۔ کوئی بھی پھل۔۔۔۔“

ملکہ کی آنکھیں نڈھال ہو کر ایک پل کے لئے مُندھ گئیں، پھر کسی اندرونی طاقت کے اثر سے کھل گئیں اور وہ رانی کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔

” میرے جانے کا وقت قریب آگیا ہے رانی ! میرے پاس آ۔۔۔۔ میرے سر کی رگ شاید پھٹ گئی ہے۔۔۔۔“

” میں تیرے پاس ہوں ملکہ !“

” وہ سکے۔۔۔۔“

” وہ کبھی نہ گم ہوں گے تو اس وقت ان کی فکر مت کر۔“

” تجھے ایک بات بتاتی ہوں۔“

” بتا !“

” وہ سکے شاید تیرے کسی کام نہ آئیں۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔“

” مگر تو تو کہتی تھی کہ وہ بڑے قیمتی ہیں۔“

” بڑے ہی قیمتی ہیں۔۔۔۔“

” میں انہیں کبھی نہ کھوؤں گی ملکہ !“

"مگر وہ اس دنیا میں چلتے نہیں ۔۔۔۔۔"

رانی کے ساتھ ڈاکٹر بھی ملکہ کے قریب آگیا۔

ملکہ اپنی ٹوٹتی ہوئی آواز کو جوڑ کر کہنے لگی "ان میں ایک سکّہ ہے 'محبت' کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک 'یقین' کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک 'امن' کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے قیمتی سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

پھر ملکہ کی آواز کسی کو سنائی نہ دی۔

رانی نے گھبرا کر ملکہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر کچھ دیر ملکہ کی نبض دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کمبل کا کونا اٹھا کے ملکہ کے منہ پر ڈال دیا۔

رانی کے من میں جو سب سے پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ آج ملکہ نہیں مری تھی۔ آج عورت کے حسن کو دی جانے والی اس دنیا کی تمام تشبیہات مر گئی تھیں۔